احمد فراز

یادوں کا ایک سُنہرا ورق

اشفاق حسین

اشفاق حسین کی تصانیف

احمد فراز

یادوں کا ایک سنہرا ورق

اشفاق حسین
کینیڈا

نام کتاب: احمد فراز - یادوں کا ایک سنہرا ورق

مصنف: اشفاق حسین

مقام و تاریخ اشاعت: کراچی - اکتوبر ۲۰۰۸ء

مطبع: الشرالائن گرافک

ناشر: وجدان پبلی کیشنز

اہتمام: حسن ظہیر

تقسیم کار: ویلکم بک پورٹ (پرائیویٹ) لمیٹڈ اردو بازار کراچی

قیمت: دوسو روپے (دس ڈالر)

رابطے کے لیے:

Ashfaq Hussain
5 Grafton Crescent, Brampton,
Ontario, Canada L6P 0L9
Ph: 001-905 915 3499
email: urdughazal@hotmail.com

کشور ناہید کے نام

سرشتِ عشق نے افتادگی نہیں پائی

تو قدِ سرو نہ بینی و سایہ پیمائی

(محاصرہ — احمد فراز)

ترتیب

عنوان	صفحہ

حرفِ آغاز

ابھی احمد فراز کو ہم سب سے جدا ہوئے چند دن ہی ہوئے ہیں۔ ابھی ان کی شاعری کا صحیح مقام اور مرتبہ متعین کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ ابھی تو ہم سب ان کا سوگ منا رہے ہیں' ان کی یاد منا رہے ہیں' ان کی خوب صورت شخصیت کو یاد کر رہے ہیں اور ان سے اپنے تعلق پر ناز کر رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر کسی شاعر کا کوئی ایک بھی شعر لوگوں کے حافظے میں محفوظ ہے یا ان کے دلوں میں گھر کر چکا ہے تو اس شاعر کو مرحوم نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ تخلیق کار اپنے اشعار کے لباس میں ہماری بزم کا ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ اور احمد فراز تو اپنی ہر دل عزیز شاعری کی وجہ سے ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں' لاکھوں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن بن چکے تھے۔ بھلا ایسے زندہ شاعر تک موت کی رسائی کہاں ممکن ہو سکتی ہے۔ احمد فراز آج بھی اپنی زندگی سے بھرپور شاعری کے ساتھ ہماری بزم میں موجود ہیں۔ صرف اپنی شاعری ہی نہیں بلکہ

جدو جہد سے بھرپور زندگی اور اپنی دلچسپ باتوں کی خوشبوؤں کی وجہ سے انہوں نے آج بھی ساری فضا کو مہکا رکھا ہے۔

اسی مہکی ہوئی فضا میں سانس لیتے ہوئے' میں اپنی ادھر ادھر بکھری ہوئی کچھ پرانی تحریروں میں' احمد فراز کے نقش و نگار کو تلاش کر رہا ہوں۔ اور اس تلاش کے نتیجے میں اور اس میں کچھ تازہ اضافوں کے بعد ایک مختصر سی کتاب ترتیب پا گئی ہے۔ اس میں کچھ یادیں ہیں اور کچھ وہ مضامین اور انٹرویو ہیں جو ٹورنٹو کے قیام کا تحفہ ہیں۔ سو اس تحفے کو میں بغیر کسی کانٹ چھانٹ اور کسی تریب کا لحاظ کیے بغیر احمد فراز کے چاہنے والوں تک پہنچانا چاہتا ہوں کہ وہ بھی یادوں کے اس نگار خانے میں میرے ساتھ شریک ہو سکیں۔

اشفاق حسین

ٹورنٹو ستمبر ۲۰۰۸ء

آخری مشاعرہ' آخری ملاقات

احمد فراز سے میری پہلی ملاقات کراچی میں ۱۹۷۵ میں اس وقت ہوئی تھی جب انہیں یوم مئی کے مشاعرے میں اسلام آباد سے مدعو کیا گیا تھا۔ اُن دنوں کراچی میں ترقی پسند ساتھیوں کی دعوت پر وہ ہر سال اس مشاعرے میں شرکت کے لیے آتے تھے۔ ایئر پورٹ پر ان کا استقبال کرنے والوں میں اپنے دوست مجاہد بریلوی کے ساتھ ساتھ میں نے بھی زبردستی اپنا نام شامل کروالیا تھا کہ کم از کم ان کو قریب سے دیکھنے کا ایک موقعہ تو ملے گا۔ وہ ان کی شہرت اور مقبولیت کے عروج کا زمانہ تھا۔ لیکن اُن سے اصل شناسائی کا دور ٹورنٹو میں ۱۹۸۲ء سے شروع ہوا جب وہ ایک سیاسی جلاوطن شاعر کی حیثیت سے پہلی بار کینیڈا آئے اور پھر ۱۹۸۸ء کے بعد سے یہاں ان کی میزبانی کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ یہ زمانہ ٹورنٹو کے حوالے سے اپنی ایک علاحدہ ادبی تاریخ رکھتا ہے۔

آخری بار اُن سے واشنگٹن کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی جو اُن کی زندگی کا آخری مشاعرہ ثابت ہوا- امریکہ کے پاکستانی نژاد ڈاکٹروں کی تنظیم 'اپنا' کے زیرِ اہتمام اس سال واشنگٹن میں چار روزہ کنونشن تھا جس میں سیاسی اور سماجی مذاکرے' پروفیشنل سیمینار' موسیقی کی محفلوں' نمائش اور محفلِ مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا- پاکستان سے مدعوئین کی فہرست میں سیاست' ادب اور ثقافت کے بڑے بڑے اسمائے گرامی شامل تھے جن میں احمد فراز کے علاوہ ضیا محی الدین' بیرسٹر اعتزاز احسن' جسٹس وجیہ الدین اور دوسرے بہت سے اہم نام تھے- مشاعرہ ۲۸ جون ہفتہ کے روز ہونا تھا جس کے صدر احمد فراز اور مہمان خصوصی پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب تھے- 'اپنا' کی ادبی کمیٹی نے اس سال مجھے بھی کینیڈا سے اس مشاعرے میں مدعو کیا تھا-

جمعہ ۲۷ جون کی شام جب میں واشنگٹن پہنچا تو وہاں ہال میں بہت سے لوگ نظر آئے جن میں ایک طرف تو پاکستان کے سفیر برائے امریکہ حسین حقانی تھے تو دوسری طرف وکلا تحریک کے روحِ رواں اعتزاز احسن تھے اور وہ دونوں اپنے اپنے ہم خیال لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے لیکن ادبی برادری کا کوئی بھی فرد اس وقت مجھے وہاں نظر نہ آیا- معلوم ہوا احمد فراز اور پروفیسر گوپی چند نارنگ اور دیگر مہمان دوسرے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں جو کنونشن کی اصل جگہ سے تھوڑے سے فاصلے پر تھا- میری بکنگ بھی وہیں تھی- ہوٹل میں چیک ان کرنے کے بعد جب میں نے ان حضرات کو فون کیا تو وہاں کوئی موجود نہ تھا سو میں نے ان کے لیے پیغام ریکارڈ کروا

دیا۔

دوسری صبح ابھی سو کر بھی نہ اٹھا تھا کہ احمد فراز نے فون پر دوستانہ انداز میں حکم دیا "فوراً میرے کمرے میں آ جاؤ"۔ ان کے کمرے میں پہنچا تو وہاں افتخار نسیم سے بھی ملاقات ہو گئی۔ افتی نسیم اس سے ایک دن پہلے ہونے والے پنجابی مشاعرے میں شرکت کے لیے شکاگو سے آیا تھا اور واپسی کے لیے اپنا سامان ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ہنستے ہوئے بولا کہ اچھا اب میں چلا اور فراز صاحب تمہارے حوالے' گھنٹے بھر سے میں کہے چلا جا رہا ہوں کہ میری فلائٹ مس ہو جائے گی مگر یہ جانے ہی نہیں دیتے کہ میں اکیلا ہو جاؤں گا۔ فراز نے افتی کی پیٹھ پر ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ ٹھیک ہے اب تم جاؤ' اب میں اکیلا نہیں ہوں۔

احمد فراز مجھ سے ہمیشہ کی طرح بڑی محبت سے بغلگیر ہوئے۔ میں ان سے تقریباً ڈیڑھ سال کے بعد مل رہا تھا۔ مجھے وہ بہت کمزور نظر آئے۔ کہنے لگے کہ معمولی سا اسٹروک ہوا تھا لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ حالانکہ ان کے چہرے پر بالکل ٹھیک والے اثرات بالکل نہ تھے۔ انہوں نے اسلام آباد میں سال گزشتہ ہونے والے اپنے اسٹروک کا پورا واقعہ سنایا کہ کس طرح آدھی رات کے بعد انہیں ہلکا سا اسٹروک ہوا مگر فوراً اسپتال جانے کے بجائے صبح کا انتظار کرتے رہے کہ کون اتنی رات گئے ڈاکٹروں کو تکلیف دے۔ انہوں نے پاکستانی ڈاکٹروں کی دل کھول کر داد دی کہ جنہوں نے بے حد خلوص اور توجہ سے ان کی دیکھ بھال کی۔ کہنے لگے کہ اسلام آباد کے اسپتال میں تین یا چار دن تک میں بیڈ پر ہی تھا کہ پھر اچانک میں نے سوچا

کہ یہاں پڑے پڑے بور ہورہا ہوں' کیوں نہ بستر سے اٹھ کر اسپتال کا چکر لگایا جائے۔سو میں نے ایک خاصا بڑا چکر لگایا اور جب واپس بستر پر آیا تو ڈاکٹروں کو بھی حیرانی تھے کہ یہ سب کچھ کیوں کر ہوا۔سب ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی کہ ایسا Few in Millions ہوا کرتا ہے۔ ابھی وہ اپنی بیماری کے واقعے کا ذکر ہی کر رہے تھے کہ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔دوسری طرف پروفیسر گوپی چند نارنگ تھے۔ فراز صاحب نے کہا یار اُن سے کہدو کہ وہ بھی یہیں آ جائیں۔نارنگ صاحب نے کمرے میں آنے کے بجائے نیچے لابی میں ملنے کو کہا تا کہ کچھ دیر باہر گھوم پھر لیا جائے۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں نیچے لابی میں نارنگ صاحب کا انتظار کر رہے تھے۔اس دوران بہت سے لوگ جن میں زیادہ تر ڈاکٹر تھے اور اسی کنونشن میں شرکت کے لیے آئے تھے' احمد فراز سے آ آ کر ہاتھ ملا رہے تھے۔ایک ڈاکٹر صاحب نے انہیں اپنی بیوی سے ملواتے ہوئے کہا کہ یہ آپ کی بہت بڑی مداح ہیں اور اس کنونشن میں صرف اور صرف آپ کو سننے کے لیے آئی ہیں۔خاتون نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور تصویر کھنچوانے کے ساتھ ساتھ ان سے کہنے لگیں کہ آج کی صبح میری زندگی کی بہت خوب صورت صبح ہے۔میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ کو رات مشاعرے ہی میں دیکھ سکوں گی مگر حسن اتفاق دیکھیے کہ یہاں آپ کو اتنی نزدیک سے دیکھنے اور آپ سے ملنے کا موقعہ مل گیا۔اسی دوران نارنگ صاحب بھی ڈاکٹر عبدالرحمان عبد کے ساتھ آ گئے اور طے یہ پایا کہ آج کا دن بہت خوشگوار ہے لہٰذا باہر نکل کر کسی مناسب جگہ پر چائے پی جائے۔فراز نے شرط لگا دی کہ ریسٹورنٹ ایسا ہونا چاہیے جس کے باہر بیٹھ کر سگریٹ

بھی پی جا سکے۔ وہ شراب کے بغیر تو رہ سکتے تھے لیکن سگریٹ کے بغیر ان کا گزارا مشکل تھا۔ مجھے اچانک دس بارہ سال پہلے کا ٹورنٹو کا ایک واقعہ یاد آ گیا جب ان کی ایک مداح نے ان سے کہا فراز صاحب آپ اتنے اچھے شاعر ہیں مگر سگریٹ کیوں اتنا پیتے ہیں؟ فراز صاحب ہنسنے لگے تو خاتون نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے ذرا بردباری سے کہا کہ جدید تحقیق کے مطابق ساٹھ فیصد سے زیادہ لوگوں کو سگریٹ کی وجہ سے ہی کینسر ہوتا ہے۔ فراز نے برجستہ جواب دیا کہ تحقیق بالکل ٹھیک ہے اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں ان چالیس فیصد لوگوں میں سے ہوں جن کو سگریٹ پینے سے کینسر نہیں ہوتا۔ لہٰذا آپ مجھے سگریٹ پینے دیں۔ خاتون مسکرا کر رہ گئیں۔

احمد فراز، گوپی چند نارنگ اور ہم سب لوگ اپنے ہوٹل سے نکل کر باہر سڑک پر چلنے لگے۔ آج واشنگٹن میں موسم بہت اچھا تھا، بہت سارے لوگ جاگنگ کرتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ احمد فراز کو چلنے میں کچھ دشواری پیش آ رہی ہے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور ان کے بولنے کے انداز میں بھی وہ روانی نہیں تھی جو ان کی پہچان تھی۔ اب ہمیں کسی ایسے ریسٹورنٹ کی تلاش تھی جہاں وہ اطمینان سے بیٹھ کر سگریٹ پی سکیں۔ بڑی مشکلوں کے بعد ایک دیسی ریسٹورنٹ میں ایسی سہولت نظر آئی۔ ہم لوگ باہر بیٹھ کر چائے پینے اور گپ شپ کرنے لگے۔ اس دوران بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی ادھر سے گزرتے ہوئے احمد فراز سے علیک سلیک کرتے رہے۔ فراز وہاں سے جلد اٹھنے کے موڈ میں نظر

نہیں آرہے تھے لیکن ہم لوگ کانفرنس کے اس سیشن میں ضرور شرکت کرنا چاہتے تھے جس میں ایک ہی اسٹیج پر حسین حقانی' اعتزاز احسن اور جسٹس وجیہ الدین اپنے خیالات کا اظہار کرنے والے تھے- فراز صاحب کے اٹھنے اٹھنے نے اتنی دیر کر دی کہ ہم وہاں وقت پر نہ پہنچ سکے جس کا ہمیں بے حد افسوس تھا- کانفرنس میں جانے سے پہلے وہ واش روم میں چلے گئے اور نارنگ صاحب اور میں ان کے انتظار میں باہر کھڑے رہے- خلافِ توقع کافی وقت لگ گیا- جب پندرہ بیس منٹ سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا تو نارنگ صاحب نے مجھ سے کہا اندر جا کر دیکھیے خیریت تو ہے- اتنے میں احمد فراز مسکراتے ہوئے باہر آ گئے- انہوں نے ہم سے کچھ کہا تو نہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں گردے کی تکلیف تھی جس کا اظہار بعد میں ہوا- ہم لوگوں نے وہیں دوپہر کا کھانا کھایا اور تھوڑی دیر بعد اپنے ہوٹل میں واپس آ گئے- تنہا تنہا کے خالق' احمد فراز تنہا نہیں رہنا چاہتے تھے انہوں نے نارنگ صاحب اور مجھ سے کہا کہ ابھی کچھ دیر چل کر کمرے میں بیٹھتے ہیں مگر ہم دونوں کا خیال تھا کہ رات کو مشاعرے میں دیر تک جاگنا ہوگا لہٰذا تھوڑی دیر آرام کر لیا جائے- طے یہ ہوا کہ شام سات بجے ملیں گے مگر میں ابھی کمرے میں سونے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف احمد فراز' فیض صاحب والے انداز میں کہہ رہے تھے بھئی کہاں رہ گئے؟ اب تو اندھیرا ہونے والا ہے- میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو ابھی شام کے صرف ساڑھے پانچ بجے تھے اور ہم لوگ انہیں چار بجے کے قریب اُن کے کمرے میں چھوڑ کر آئے تھے- میں نے کہا فراز صاحب ہمیں تو سات بجے ملنا تھا- کہنے لگے ارے چھوڑیں سات بجے کو بس

آپ فوراً ادھر آجائیں۔

تھوڑی دیر بعد جب میں ان کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ بستر پر آرام کرنے کے بجائے کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے یار یہ کافی میکر یہاں رکھا ہوا ہے مگر مجھے اس کا طریقہء استعمال نہیں معلوم۔ اگر آپ بنا سکیں تو ٹھیک ہے ورنہ روم سروس کو آرڈر کر دیں۔ کافی بنانے کے لیے پانی لینے جب میں واش روم میں گیا تو وہاں ان کے موزے گیلے پڑے ہوئے تھے جن سے پیشاب کی بو سی آرہی تھی اور شاید انہوں نے سکھانے کے لیے ڈالا ہوا تھا۔ اب مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوا کہ انہوں نے دوپہر کے وقت صرف پیشاب کرنے کے لیے بیس پچیس منٹ کے قریب واش روم میں کیوں لگا دیے تھے۔ میں نے کافی میکر میں پانی ابالنے کے لیے رکھا اور واپس جا کر ان کے موزے دھوئے اور اس خیال سے کہ رات کو مشاعرے میں جانے تک شاید یہ موزے سوکھ نہ سکیں تو کمرے میں رکھی ہوئی استری آن کر کے اسے سکھانے لگا۔ فراز صاحب وہیں کرسی پر براجمان تھے کہنے لگے کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا موزوں پر استری کر رہا ہوں تاکہ جلدی سوکھ جائیں۔ کہنے لگے نہیں' نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے میرے پاس دوسرے موزے ہیں' میں وہ پہن لوں گا۔ آپ بس ادھر آجائیں۔ میں نے اپنے اور ان کے لیے کافی تیار کی حسبِ موقعہ کچھ پاکستان کی سیاست کا ذکر چل نکلا۔

ابھی تک جنرل پرویز مشرف ملک کے صدر تھے اور عدلیہ کی بحالی کے آثار دور دور تک نظر نہیں آرہے تھے۔ احمد فراز اس سیاسی صورتِ حال اور پیپلز پارٹی

کی موجودہ سیاسی روش سے خاصے آزردہ تھے۔ کہنے لگے یہ وہ پیپلز پارٹی نہیں جو بھٹو کی پارٹی تھی۔ پھر خود ہی بتانے لگے کہ وکلا کے احتجاجی لانگ مارچ کے اختتام پر جو جلسہ اسلام آباد میں ہوا تھا اُس میں انہوں نے اس شرط پر شرکت کی تھی کہ وہاں جلسہ گاہ میں پیپلز پارٹی کے بھی جھنڈے نظر آنے چاہئیں۔ ان کی رائے کا قطعی علم ہونے کے باوجود میں نے جب ان سے پوچھا کہ کیا جنرل پرویز مشرف اقتدار چھوڑ دیں گے تو انہوں نے پورے وثوق کے ساتھ کہا کہ ایسا آسانی سے ہرگز نہیں ہوگا۔ فوجی جب ایک بار اقتدار کا مزہ چکھ لیتا ہے تو پھر اس کا نشہ آسانی سے نہیں اترتا۔ اس موقعے پر انہوں نے جنرل ایوب خان کے حوالے سے ایک واقعہ سنایا جو ۱۹۵۸ء کے مارشل لا سے متعلق تھا۔ کہنے لگے اُس زمانے میں کراچی میں ملک اشرف ایک بڑے بزنس مین تھے' ان کے بھتیجے یا بھانجے نے مجھے بتایا کہ ان دنوں جنرل ایوب خان نے ملک اشرف سے ایک میٹنگ کی اور اس سے کہا کہ حکومت کی نیت کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔ وہ شاید اس بار میری ملازمت میں توسیع نہ کرے تو میں سوچتا ہوں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی کاروبار کروں۔ چنانچہ تم مجھے کوئی مشورہ دو۔ ملک اشرف نے کہا کہ کاروبار کے لیے تو سرمایہ درکار ہوتا ہے تم بتاؤ کہ تمہارے پاس کتنا سرمایہ ہے؟ ایوب خاں نے حساب کتاب لگا کر جس میں پراویڈنٹ فنڈ کی رقم اور دوسری جمع پونجی بھی شامل تھی سب گن کر بتایا تو کل رقم تقریباً چار ساڑھے چار لاکھ روپے بنتی تھی۔ (اس وقت یہ رقم بھی خاصی ہوا کرتی تھی) ملک اشرف نے کہا یہ پیسے تو بہت کم ہیں۔ اس سے کوئی بڑی فیکٹری ویکٹری تو نہیں لگ سکتی البتہ ان پیسوں میں ایک کاروبار

ہوسکتا ہے جو آج کل بہت فائدہ مند ہے اور وہ کاروبار گارمنٹ ایکسپورٹ کرنے کا ہے- یورپ میں ہمارے ریڈی میڈ گارمنٹس کی بہت ڈیمانڈ ہے- ایوب خان نے کہا تو کیا میں کمانڈر انچیف بننے کے بعد اب کپڑے بیچوں گا؟ بات آئی گئی ہوگئی اور پھر کچھ دنوں ہفتوں یا مہینوں کے بعد پاکستان میں ایوب خاں نے مارشل لا لگا دیا- فراز صاحب کہنے لگے جب فوجی جنرل چھاؤنیوں سے نکل کر اقتدار کی چمک دمک دیکھتے ہیں تو ان کے دماغ خراب ہو جاتے ہیں- وہ ایوب خاں ہو' یحییٰ خاں ہو' ضیا الحق ہو یا جنرل مشرف' اقتدار ملنے کے بعد سب ایک ہی طرح کے ہو جاتے ہیں-

گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے ان سے ایک اور سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ جب جنرل ضیا الحق نے مارشل لا لگایا تو تمام رائٹ ونگ قوتوں نے جن میں جماعت اسلامی' جمعیت علمائے اسلام' جمعیت علمائے پاکستان' تمام مذہبی جماعتوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ' وکلا اور صحافیوں نے غرض یہ کہ جن جن لوگوں کا بھی تعلق یا جن جن حضرات کے بھی نظریات دائیں بازو والوں سے ملتے تھے ان سب ری ایکشنری طاقتوں نے ضیا الحق کی کھل کر حمایت کی اور اپنے مقاصد کے حصول میں خاصی کامیابی حاصل کی- اپنے مخالفین سے چن چن کر بدلے لیے اور اپنے لوگوں کو آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے- آج بھی ان کی فکر سے وابستہ افراد اہم جگہوں پر تعینات ہیں اور اپنی رجعت پسندانہ سوچ کو بڑی ڈھٹائی سے معاشرے میں پھیلا رہے ہیں- تو اگر اتفاق سے ایک جنرل خود اپنے ذاتی اقتدار کو تحفظ دینے کی وجہ سے یا بیرونی طاقتوں کے دباؤ کے تحت روشن خیالی کی باتیں کر رہا تھا تو لیفٹ

ونگ فورسز نے اس کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو مضبوط کیوں نہیں کیا؟ اس پر فراز صاحب نے کہا کہ بھئی ہم لوگوں نے شروع میں تو اس کے لبرل خیالات کو سراہا تھا لیکن جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ سب کچھ بدنیتی کی بنیاد پر ہے تو ہم نے تو یہ کہہ کر اپنے اعزازات وغیرہ کو خود ٹھکرا دیا تھا کہ

اُس نے چاہت کے عوض ہم سے اطاعت چاہی
ہم نے آداب کہا اور اجازت چاہی

گفتگو کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ کانفرنس میں شرکت کرنے والے کچھ ڈاکٹر صاحبان فراز سے ملنے آ گئے۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر صاحب فراز کو شام کے وقت ڈرنک اور کھانے کے لیے کہیں باہر لے جانا چاہتے تھے۔ مشاعرہ کمیٹی کے نگراں ڈاکٹر سلمان ظفر اور ان کی بیگم ڈاکٹر شمیم نے مجھے خاص طور سے یہ ہدایت کی تھی کہ مشاعرے سے پہلے فراز کو کہیں ڈرنک وغیرہ کے لیے باہر کسی کے ساتھ نہ جانے دیں۔ چنانچہ فراز کے اس مداح سے میں نے کہا کہ منتظمین مشاعرہ نے تمام شعرا کے کھانے کا اہتمام ہوٹل ہی میں کر رکھا ہے البتہ آپ کو پینے پلانے کا جو انتظام کرنا ہے وہ یہیں کمرے میں کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب بڑے بھلے مانس انسان نکلے کہنے لگے جناب ہم تو فراز صاحب کے قدموں میں کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں شراب و کباب تو صرف ملاقات کی ایک وجہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے کمرے ہی میں وہسکی کی ایک بوتل منگوا لی اور تھوڑی دیر کے لیے فراز کا کمرہ ہی میخانے میں تبدیل ہو گیا اس لیے کہ زیادہ تر لوگ جو اُن سے ملنے آ رہے تھے وہ ایک دو گھونٹ احمد فراز کے نام پر

ضرور پی رہے تھے۔ گھنٹے دو گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا اس دوران صرف اور صرف
فراز کے شعر سنے جا رہے تھے مگر خود فراز نے اپنا ایک بھی شعر نہیں سنایا۔ وہاں موجود
ہر شخص کو اُن کے کچھ نہ کچھ اشعار ضرور یاد تھے۔ نیویارک سے آئی ہوئی ایک ڈاکٹر
صاحبہ نے فراز کی نظم کالی دیوار کی فرمائش کر دی۔ ڈاکٹر عبداللہ کو یہ نظم پوری یاد تھی
انہوں نے نظم سنانے سے پہلے اس نظم کی وجہ تخلیق بتائی کہ فراز صاحب جب پہلی بار
واشنگٹن آئے تو ڈاکٹر عبداللہ ان کو شہر کی سیر کرانے لے گئے۔ اور جب انہوں نے
ویتنام میموریل دیکھا تو فراز صاحب پر ایک لمبی خاموشی طاری ہو گئی۔ شام کو گھر آنے
کے بعد انہوں نے 'کالی دیوار' کے نام سے یہ نظم لکھی۔ کالی دیوار والی نظم اپنی اصل
حالت میں ڈاکٹر عبداللہ کے پاس محفوظ رہ گئی تھی انہوں نے وہی نظم سنائی۔ کلیات میں
شائع ہونے والی نظم میں کچھ مصرعے تبدیل ہو گئے تھے۔ پروفیسر نارنگ نے ڈاکٹر
عبداللہ سے کہا کہ ان دونوں نظموں کو آپ اپنے تبصرے کے ساتھ کہیں شائع کروا دیں
تا کہ ریکارڈ پہ آ جائے۔ غرض اسی قسم کی باتوں میں شام گزر گئی فراز صاحب بھی اپنا
گلاس بہت آہستہ آہستہ خالی کر رہے تھے کہ یہ شغل میکشی کا دور تھا ہوس میکشی کا نہیں
۔ بعد میں ہم لوگ پیدل چلتے ہوئے اپنے ہوٹل سے دوسرے ہوٹل میں آئے
جہاں کھانے اور مشاعرے دونوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

مشاعرے کی نظامت میرے ذمے تھی جبکہ اس کے صدر احمد فراز اور
پروفیسر گوپی چند نارنگ اس کے مہمان خصوصی تھے۔ اس مشاعرے کی ایک دلچسپ
بات یہ بھی تھی کہ اس میں اعتزاز احسن نے بھی ایک شاعر کی حیثیت سے شرکت کی اور

پورے مشاعرے میں اسٹیج پر بیٹھے رہے-یہ ان کا پہلا بین الاقوامی مشاعرہ اور احمد فراز کا آخری مشاعرہ تھا-

مشاعرے میں سب سے پہلے میزبان ڈاکٹروں نے' اس کے بعد واشنگٹن کے شعرا نے اپنا کلام سنایا جن میں خاص طور سے مونا شہاب' ڈاکٹر عبداللہ اور شکیل آزاد شامل تھے-اس کے بعد امریکہ اور کینیڈا سے آئے ہوئے شاعروں نے اپنا کلام سنایا جن میں میرے علاوہ حمیرا رحمان' ڈاکٹر تقی عابدی' ڈاکٹر شہلا نقوی اور ڈاکٹر محمد شفیق شامل تھے- احمد فراز سے پہلے بیرسٹر اعتزاز احسن کو دعوت کلام دی گئی-ان کی شاعری سننے سے پہلے ہی ان کی شخصیت کا جادو حاضرین پر چڑھ چکا تھا -چنانچہ گو مشرف گو کے نعروں اور پرزور تالیوں میں ان کا استقبال ہوا اور انہوں نے اپنی طویل نظم میرا سفر سنا کر حاضرین سے خوب داد لی-

مشاعرے کے صدر احمد فراز جب اپنا کلام سنانے آئے تو تالیوں کی گونج میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا- وہ اپنے مخصوص لہجے میں آہستہ آہستہ اپنا کلام سنا رہے تھے اور میں نے ہی نہیں بلکہ سب نے محسوس کیا کہ اب ان کے پڑھنے کے انداز میں وہ روانی اور وہ جوش و ولولہ نہیں تھا جو پہلے کبھی ہوا کرتا تھا اور یادداشت نے بھی کسی حد تک ساتھ چھوڑ دیا تھا-لوگوں کی فرمائش پر جب انہوں نے اپنی مشہور نظم محاصرہ سنائی تو سینکڑوں بار پڑھی ہوئی اس نظم کے بھی وہ کئی مصرعے بھول رہے تھے لیکن انہیں اسٹیج پر بیٹھے ہوئے لوگ اور حاضرین دہرا رہے تھے- آخر میں مہمان خصوصی پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ہمیشہ کی طرح شہد کی سی مٹھاس میں ڈوبی ہوئی

زبان میں اردو زبان اور جنوبی ایشیا میں اس کے ثقافتی اثرات کے موضوع پر تقریر کی اور واقعی تقریر کا حق ادا کر دیا۔

مشاعرہ تقریباً تین بجے صبح ختم ہوا اور وہاں سے نکلتے نکلتے اور لوگوں سے ملتے ملتے چار بج گئے۔ ہم لوگ پیدل ہی اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوٹل میں پہنچتے ہی فراز نے کہا کہ بھوک لگ رہی ہے لہٰذا سونے سے پہلے کچھ کھا لینا چاہیے۔ چنانچہ میں اور نارنگ صاحب فراز کے ساتھ ان کے کمرے میں آ گئے اور میں نے فون پر کھانے کی کچھ چیزیں آرڈر کر دیں۔ کل رات کے مشاعرے سے لے کر موجودہ دور کے اردو شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ ہم لوگ کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو اچانک سورج کی روشنی سے پورا کمرہ جگمگانے لگا۔ نارنگ صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ آپ دونوں تو شاعر حضرات ہیں اور شاعروں کی راتیں تو کالی ہوتی ہی رہتی ہیں مگر اب چل کر کمرے میں تھوڑی دیر سو لینا چاہیے کیوں کہ بارہ بجے چیک آؤٹ کا وقت ہے اور اس وقت صبح کے ساڑھے چھ بج چکے ہیں۔ بمشکل تمام فراز سے اجازت لے کر ہم لوگ اپنے اپنے کمروں کی طرف روانہ ہوئے۔ میں اپنے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی اور دوسری طرف سے فراز صاحب کہہ رہے تھے کہ بھئی ساڑھے دس بج چکے ہیں ابھی تک آپ سو رہے ہیں؟ بس تیار ہو کر فوراً ادھر آ جائیں۔

ان کے کمرے میں جب پہنچا تو وہ اپنا سوٹ کیس پیک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے بھی ان کی اس کوشش میں ان کا ہاتھ بٹایا اور ساتھ ہی

ساتھ ان کو یاددہانی بھی کراتا رہا کہ انہیں اگلے روز یعنی ۳۰ جون پیر کے دن کینیڈین سفارت خانے میں ویزا لینے ڈاکٹر عبداللہ کے ساتھ جانا ہے۔ ہوا یہ تھا کہ اس سال کے شروع میں انہیں میں نے کینیڈا آنے کی دعوت دی تھی مگر وہ اپریل کے مہینے میں جب امریکہ تک آئے تو کینیڈا کا ویزا اُن کے پاس نہیں تھا۔ مجھ سے وعدہ کیا کہ جون کے مہینے میں یہاں پھر آنا ہوگا تو اس وقت ٹورنٹو ضرور آؤں گا۔ مگر اس بار بھی وہ کینیڈا کا ویزا لے کر نہیں آئے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک ویزے وغیرہ کا انتظام پورا نہ ہو جائے مشاعرے کی تاریخ کا اعلان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ان کے پاکستان چلنے سے پہلے وہاں فون کیا تھا تو کہنے لگے کہ میرا لندن میں محسن احسان کی عیادت کرنے کے لیے جانا بہت ضروری تھا اس لیے میں نے پہلے برطانیہ کے ویزے کے لیے اپلائی کیا مگر وہاں سے پاسپورٹ چند دنوں قبل ہی واپس آیا ہے لہٰذا اب آپ واشنگٹن کے مشاعرے میں شرکت کے لیے آ رہے ہیں تو میرے لیے نیا دعوت نامہ وہیں لیتے آئیں میں وہیں واشنگٹن میں ویزے کی درخواست دوں گا۔ چنانچہ واشنگٹن پہنچ کر میں نے سب سے پہلے ڈاکٹر عبداللہ سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ فراز صاحب کو لے کر کینیڈین سفارت خانے چلے جائیں۔ انہوں نے عدہ کیا کہ وہ ضرور پیر کے روز ہی جا کر ویزے کے لیے اپلائی کروا دیں گے۔

ان کی پیکنگ مکمل ہوگئی تو میں نے کچھ دیر بیٹھنے کے بعد ان سے رخصت ہونے کی اجازت لی۔ فراز صاحب اٹھ کر بہت محبت سے بغلگیر ہوئے اور کہنے لگے کہ بس میں بھی ڈاکٹر عطیہ اور طارق کا انتظار کر رہا ہوں وہ لوگ بھی آتے ہی

ہوں گے- پھر میں ہوٹل سے چیک آؤٹ کر کے انہی کے گھر چلا جاؤں گا اور وہیں پر فون کے ذریعے رابطہ رہے گا-

نیچے ہوٹل کی لابی میں نارنگ صاحب اور تقی عابدی پہلے سے موجود تھے- ہم تینوں کو ایک ہی گاڑی میں ایرپورٹ جانا تھا- گاڑی آنے میں کچھ دیر تھی تو ہم لوگ وہیں ہوٹل کے کیفے ٹیریا میں کافی پینے بیٹھ گئے- ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ احمد فراز بھی اپنا سامان لے کر لابی میں آ گئے- میں نے پوچھا کیا ڈاکٹر عطیہ آ گئیں تو کہنے لگے نہیں بس آتی ہی ہوں گی میں کمرے میں اکیلا تھا سوچا نیچے آ جاؤں- مجھے افتی کی کہی ہوئی بات ایک بار پھر یاد آ گئی کہ اشفاق' ان دنوں فراز صاحب اکیلے رہنے سے گھبرانے لگے ہیں- وہ بزم آرائی کے شوقین تھے اور ہر دم اپنے لوگوں اور مداحوں کے درمیان ہی رہنا چاہتے تھے-

بہت سے لوگ اکثر کہتے ہیں کہ آخر اس عمر میں فراز صاحب کو اتنا سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی- اب انہیں کون سمجھائے کہ یہی تو ان کی زندگی تھی- اچھی شامیں اور اپنی پسند کے لوگوں سے ملاقاتیں ان کی زندگی کے لیے سب سے زیادہ ضروری تھیں- ان کے بغیر فراز کی زندگی' زندگی نہیں تھی-

بہرحال ڈاکٹر عطیہ کے آنے سے پہلے ہماری گاڑی آ گئی اور ہم سب لوگ ایرپورٹ کے لیے روانہ ہو گئے- فراز صاحب سے ایک بار پھر گلے ملے مگر وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ثابت ہو گی-

کینیڈا آنے کے بعد پیر کی شام کو جب میں نے فون کیا تو فراز نے

بتایا کہ وہ آج کینیڈین سفارت خانے گئے تھے مگر جب وہاں پہنچے تو اس وقت تک ویزا
کاؤنٹر بند ہو چکا تھا اب کل صبح سویرے جا کر ویزا لوں گا۔ میں نے ان سے کہا کہ کل تو
پہلی جولائی کی وجہ سے کینیڈا ڈے کی چھٹی ہوگی لہٰذا آپ دوسرے روز ۲ جولائی
کو جایئے گا۔ ۲ جولائی کا پورا دن گزر گیا ان کی کوئی اطلاع نہیں ملی دوسرے دن ۳
جولائی کو ڈاکٹر عطیہ کے گھر ان سے فون پر بات ہوئی۔ میں نے ان سے ویزے کے
بارے میں پوچھا تو فراز صاحب نے ہنستے ہوئے پورا قصہ سنایا۔ معلوم ہوا کہ ویزا لینے
کے لیے جب کینیڈین سفارت خانے پہنچے تو ڈاکٹر عبداللہ نے انہیں بالکل دروازے
پر اتارا اور یہ کہہ کر گئے کہ گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔ اس دوران فراز صاحب
سیڑھیوں سے گر پڑے اور ان کے سر، گھٹنے اور کہنی پر چوٹ آئی اور چہرے پر بھی کئی
خراشیں پڑ گئیں۔ وہ کہنے لگے اس وقت میرے پورے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں
اب ایسی حالت میں تو میں مشاعرہ پڑھنے ٹورنٹو نہیں آ سکتا بلکہ سوچ رہا ہوں کہ جلد از
جلد گھر چلا جاؤں۔ میں نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور ان کی بات سے
اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ یقیناً ایسی حالت میں ان کو پاکستان واپس چلے جانا چاہیے۔
پھر انہوں نے کہا کہ میری پاکستان واپسی کی سیٹ جتنی جلد ممکن ہو کنفرم کروا دوں۔
دوسرے دن جب میں نے بکنگ نمبر لینے کے لیے فون کیا تو ڈاکٹر عطیہ نے بتایا کہ
امریکہ میں پی آئی اے کے مینیجر سے بات ہو گئی ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ وہ اس کا
بندوبست کروا دیں گے۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ جلد ہی بخیریت گھر پہنچ جائیں گے۔
فراز صاحب اس وقت سو رہے تھے لہٰذا ان سے بات نہ ہو سکی۔

ایک ہفتہ کے بعد اطلاع ملی کہ فراز صاحب تو بہت بیمار ہیں اور وہ شکاگو کے اسپتال میں داخل ہو چکے ہیں تو مجھے بالکل یقین ہی نہیں آیا- میرے حساب سے تو انہیں اس وقت پاکستان میں ہونا چاہیے تھا یا وہیں واشنگٹن میں ڈاکٹر عطیہ کے گھر پر ہونا چاہیے تھا- بعد میں پتہ چلا کہ چونکہ ان کی سیٹ فوراً کنفرم نہ ہو سکی تھی لہٰذا وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے پاس شکاگو چلے گئے تھے جہاں ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور وہ اسپتال میں داخل ہو گئے- شکاگو میں افتی سے فون پر بات ہوئی تو اس نے تفصیل بتائی کہ وہ ابھی آئی سی یو میں ہیں اور ان کے ایک گردے نے بالکل ہی کام کرنا چھوڑ دیا ہے- دوسرے دن خدانخواستہ ان کے انتقال کی خبر پوری دنیا میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی- تصدیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی مگر ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے دوسرے گردے نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا ہے اور اب وہ آسانی سے کسی کو پہچان بھی نہیں رہے ہیں- ظاہر ہے اس دوران فراز صاحب سے رابطے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا چنانچہ ادھر ادھر کی خبروں سے ہی ان کی حالت کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہیں- پھر پتہ چلا کہ ۱۳ اگست کو وہ ٹورنٹو سے پی آئی اے کی پرواز کے ذریعے اسلام آباد جائیں گے-

شکاگو سے انہیں ٹورنٹو لایا گیا اور جب ایک ٹرمینل سے انہیں دوسرے ٹرمینل پر ایمبولینس کے ذریعے منتقل کیا جا رہا تھا تو مجھے آخری بار انہیں ایرپورٹ پر دیکھنے کا موقعہ ملا- صرف دیکھنے کا ہی موقعہ ملا کیوں کہ ان سے بات تو ہو نہیں سکتی تھی- اس ملاقات کا دورانیہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے قریب تھا- ان کے ساتھ ایک نرس اور ان

کا بیٹا شبلی سفر کر رہے تھے۔ شبلی نے بتایا کہ وہ کسی کو پہچان نہیں رہے ہیں مگر انہیں اس وقت بہت حیرت ہوئی جب انہوں نے دیکھا کہ اسٹریچر پر لیٹے ہوئے احمد فراز کی آنکھوں میں تھوڑی سی جنبش ہوئی اور انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ آہستہ سے اٹھایا۔ کچھ دیر تک وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیے رہے جیسے کہہ رہے ہوں کہ اشفاق دیکھو میں نے ٹورنٹو آ کر تم سے اپنا کیا ہوا وعدہ نبھا دیا۔ یہ اپنے دور کے ایک بہت خوب صورت شاعر سے میری آخری ملاقات تھی۔

پاکستان میں فراز سے پہلی ملاقات

احمد فراز کی شاعری سے تعلق تو زمانہء طالب علمی سے ہی ہو چکا تھا لیکن ان سے ملاقات کا موقعہ کراچی میں ترقی پسند ساتھیوں کی جانب سے منعقد کیے جانے والے یوم مئی کے مشاعروں سے ہوا۔ یہ ۷۵-۱۹۷۴ء کا زمانہ تھا۔ میں ابھی یونیورسٹی سے فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک دن میرے یونیورسٹی کے دوست مجاہد بریلوی جو اب ایک معتبر صحافی کے طور پر اپنی علاحدہ شناخت رکھتے ہیں' انہوں نے کہا کہ کراچی کے کنزک ہال میں یوم مئی کے مشاعرے کی تمام تیاریاں ہو چکی ہیں اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اسلام آباد سے احمد فراز نے بھی اس مشاعرے میں اپنی شرکت کی تصدیق کر دی ہے۔ اس وقت میرے ساتھ سید جعفر احمد بھی تھے جنہوں نے اُسی سال کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ آج کل وہ کراچی یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈیز کے شعبہ سے بطور پروفیسر وابستہ ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمارے پاس

کار تو کیا موٹر سائکل بھی نہیں ہے میں نے اور جعفر نے طے کیا کہ ہم احمد فراز کا
استقبال کرنے ایرپورٹ ضرور جائیں گے- البتہ احمد فراز کے لیے ایک مقامی شاعر کی
کار کا انتظام ہو چکا تھا- ان دنوں اکثر ایسا ہی ہوا کرتا تھا کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر یا
کسی خاص تقریب میں اُدھار کی کار سے کام چلا لیا جاتا تھا- بہر حال میں اور جعفر
ایرپورٹ کے قریب جانے والی بس پر سوار ہو کر اسٹار گیٹ کے بس اسٹاپ تک پہنچے
اور وہاں سے پیدل مارچ کرتے ہوئے ٹرمینل تک پہنچے (اس زمانے میں خاص ہوائی
اڈے تک کوئی بس نہیں چلتی تھی)- پرواز کے آنے سے کچھ دیر قبل کار والے شاعر بھی
ایرپورٹ پہنچ گئے- اصل میزبان ہم لوگ تھے مگر انہوں نے ہی سب سے پہلے آگے
بڑھ کر فراز کا استقبال کیا- گاڑی میں فراز کو بٹھاتے ہوئے ہم دونوں سے اخلاقاً پوچھا
کہ کیا ہمارے پاس ٹرانسپورٹ کا کوئی انتظام ہے- اس سے پہلے کہ ہم کچھ کہتے چلچلاتی
دھوپ میں تپتے ہوئے ہمارے چہروں نے خود ہی حال زار کہہ دیا- پچھلی نشست پر
ہم دونوں بیٹھ گئے اور جب راستے میں وہ مقام آیا جہاں سے ایک راستہ فیڈرل بی
ایریا کی طرف جاتا تھا اور دوسرا ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری کی طرف تو موصوف نے ہمیں
وہاں یہ کہہ کر اتار دیا کہ یہاں سے صدر کی جانب جانے والی بس مل جائے گی جو ہمیں
کنٹرک ہال تک پہنچا دے گی- (اب تو شاید کنٹرک ہال بھی نہیں ہے اور ڈالمیا سیمنٹ کا
نام بھی بدل چکا ہے)- اس زمانے تک یہ جگہ بالکل ویران تھی دور دور تک جنگلی
جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا- ہم اپنی غربت زدہ آنکھوں سے اس کار کے پہیوں کی
دھول دیکھتے رہے جس میں احمد فراز جا رہے تھے- کیوں کہ ہم اس خوش فہمی میں تھے کہ

مشاعرہ شروع ہونے سے قبل تک ہمیں احمد فراز کی صحبت میں نہ صرف بیٹھنے کا موقعہ ملے گا بلکہ شاید مشاعرے سے پہلے بھی کچھ کلام سننے کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدی۔

بہر حال اس تمام ذلت و خواری کے باوجود ہم دونوں کو ایک خاص قسم کی خوشی بھی تھی جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ دن کم از کم میرے ذہن کے صفحوں پر ایک ستارہ بن کر جگمگانے لگا اور آج تقریباً تیس بتیس برس کے بعد نہ جانے کیوں اس دن کا ایک ایک پل یادوں کے زینے سے اتر کر اس یاد داشت کا حصہ بن گیا۔

کینیڈا میں فراز سے پہلی ملاقات

۱۹۸۴ء میں ٹورنٹو میں انجمن اردو کی طرف سے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں شرکت کے لیے پہلی بار احمد فراز ٹورنٹو آئے اور پھر تو ایک طرح سے یہ ان کا دوسرا گھر بن گیا۔ٹورنٹو کے مشاعرے کے بعد انہیں شمالی امریکہ کے تقریباً سب ہی چھوٹے بڑے شہروں سے مشاعروں میں شرکت کی مسلسل دعوت ملتی رہی اور اس زمانے میں وہ ان مشاعروں میں خوشی کے علاوہ ضرورتاً بھی جایا کرتے تھے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس زمانے میں لندن میں ان کا بنیادی قیام تھا جہاں اس زمانے میں دولت مشترکہ کے رکن ملک کی حیثیت سے پاکستانیوں کو ایرپورٹ پر ہی چھ مہینے کا ویزا مل جایا کرتا تھا مگر اس سے زیادہ ٹھہرنے کے لیے انہیں ہر حال میں برطانیہ سے باہر جانا پڑتا تھا۔سو اس طرح یہ مشاعرے فراز کی ایک طرح سے ضرورت بھی بن گئے تھے۔

ٹورنٹو میں ہونے والی اس کانفرنس میں فیض احمد فیضؔ، جمیل الدین

عالی، افتخار عارف، علی سردار جعفری، گوپی چند نارنگ اور احمد فراز کے نام نمایاں تھے۔
کانفرنس کے دوسرے روز مشاعرے کا انعقاد ہونا تھا جس کی صدارت فیض احمد فیض کر رہے تھے۔ یہ مشاعرہ کئی لحاظ سے ٹورنٹو کا ایک یادگار مشاعرہ تھا۔ اسی مشاعرے میں ٹورنٹو کے لوگوں نے احمد فراز اور افتخار عارف کو پہلی بار کلام پڑھتے ہوئے سنا۔ بقیہ شعرا یعنی فیض صاحب، علی سردار جعفری صاحب اور جمیل الدین عالی صاحب اس سے پہلے بھی ٹورنٹو کے مشاعروں میں شریک ہو چکے تھے۔

کانفرنس کے انعقاد سے کچھ عرصہ پہلے احمد فراز لندن آ چکے تھے۔ اس وقت تک لندن میں ان سے رابطے کا ذریعہ افتخار عارف اور اردو مرکز لندن ہی ہوا کرتا تھا۔ افتخار عارف نے جب احمد فراز کی لندن آمد کا مژدہ کانفرنس کے منتظمین کو سنایا تو ان سب کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستان میں ضیاالحق کی آمریت پر پوری طرح شباب آیا ہوا تھا۔ اسی زمانے میں فیض صاحب نے یہ کہتے ہوئے اپنی جلاوطنی کا اعلان کیا تھا کہ: مرے دل مرے مسافر / ہوا پھر سے حکم صادر / کہ وطن بدر ہوں ہم تم / اور یہی وہ دور ہے جب احمد فراز نے بھی فیض صاحب کے راستے پر چلتے ہوئے اپنی سیاسی جلاوطنی کے دور کا آغاز یہ کہتے ہوئے کیا کہ:

پھر مرے مکّے سے پیغمبر

ہجرت کر کے چلا گیا ہے

اور اب پھر سے

کعبے کے رم خوردہ بت

اصنام طلائی

اپنی اپنی مسند پر آ بیٹھے ہیں

سچ کا لہو اُن کے قدموں میں

عنابی قالین کی صورت بچھا ہوا ہے

نخوابی خیموں کے اندر

بزم حریفاں پھر سجتی ہے

کذب و ریا کی دف بجتی ہے

اس مشاعرے میں شرکت سے کچھ ہی دنوں قبل لندن سے ان کا نیا شعری مجموعہ "بے آواز گلی کوچوں میں" شائع ہو چکا تھا جس کی بیشتر نظمیں ضیاالحق کے آمرانہ دور کے خلاف ایک للکار اور بھرپور صدائے احتجاج تھیں۔ خصوصاً بھٹو کی شہادت کے حوالے سے اس مجموعے میں بڑی جاندار اور پُر اثر شاعری کی گئی تھی جسے "ایک بدنما صبح کے بارے میں کچھ نظمیں" کا عنوان دیا گیا تھا۔ اس مشاعرے میں انہوں نے جب ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے پس منظر میں اپنا کلام سنایا تو پھر تو مشاعرے کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا۔

دل کا قصہ یا افسانہ دار کا ہے

ہر محفل میں ذکر اسی دلدار کا ہے

وہ کافر اکیلا کھنچا دار پہ

نمازِ جنازہ میں سب لوگ تھے

لباسِ دار نے منصب نیا دیا ہے اُسے
وہ آدمی تھا مسیحا بنا دیا ہے اسے
سفر طویل نہ درپیش ہو مسافر کو
جو نصف شب سے بھی پہلے جگادیا ہے اسے
کچھ اپنے شہر کا قاتل بھی بے مروت تھا
کچھ اپنے عجز نے بھی حوصلہ دیا ہے اسے
فغاں کہ اہلِ ہوس کی رقابتوں نے فراز
جو شخص جانِ جہاں تھا گنوا دیا ہے اسے

آؤ جس عیسیٰ کو ہم نے سولی پر لٹکایا ہے
اُس کے لہولہان بدن پر بین کریں اور اشک بہائیں
فرض میں پورے اتر چکے اب قرض چکائیں
(حرف کی شہادت)

ٹورنٹو کے مشاعرے میں پہلی بار جب احمد فراز اپنا یہ کلام سنا رہے تھے تو ہر طرف ایک سکوت کا سا عالم تھا لیکن یہ سکوت سخن شناس نہیں بلکہ سکوت حیرانگی اور احترام سخن شناسی کی منزل تھی۔ مگر جب وہ اس منزل کے آخری موڑ پر پہنچے اور اپنی نظم ''محاصرہ'' سنانے لگے تو ہر کوئی ان کے احترام میں نہ صرف یہ کہ کھڑا ہو گیا تھا بلکہ ان

کے قدموں میں اپنا دل بھی بچھائے ہوئے تھا۔ یہ شاعری نہیں ساحری تھی اور تمام سامعین مسحور ہو چکے تھے۔ میں نے بھی پہلی بار ان کے منہ سے یہ نظم سنی تھی اور خود میں بھی ایک عجیب محویت کے عالم میں کھو گیا تھا۔ بعد کے دنوں میں بھی صرف مشاعروں ہی میں نہیں بلکہ نجی محفلوں میں بھی اس نظم کو خود انہی سے کئی کئی بار سنا لیکن اس بار کا عالم تو کچھ اور ہی تھا۔

عجیب اتفاق ہے کہ احمد فراز نے اپنی زندگی کے آخری مشاعرے میں واشنگٹن میں جو آخری نظم پڑھی وہ بھی یہی نظم محاصرہ ہی تھی۔

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اس کے
فصیلِ شہر کے ہر برج ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں لشکری اس کے
وہ برق لہر بجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارود اس کے پانی میں
وہ جوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی
سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہوئے
سپردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہوئے
تمام صوفی و سالک سبھی شیوخ و امام

امید ۔ لطف پہ ایوان ۔ کج کلاہ میں ہیں
معززین عدالت بھی حلف اٹھانے کو
مثال ۔ سایہ ء مبرم نشستہ راہ میں ہیں
تم اہل ۔ حرف کے پندار کے ثناگر تھے
وہ آسمان ۔ ہنر کے نجوم سامنے ہیں
بس اک مصاحب ۔ دربار کے اشارے پہ
گداگران ۔ سخن کے ہجوم سامنے ہیں
قلندران ۔ وفا کی اساس تو دیکھو
تمہارے پاس ہے کون آس پاس تو دیکھو
سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کے نشانہ کمان داروں کا
بس ایک تم ہو سو غیرت کو راہ میں رکھ دو
یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا
اسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے
سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لیے

کہ مجھ کو حرص ہوس ہے نہ خوف ۔ خمیازہ
اُسے ہے سطوت ۔ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اُسے شکوہ ۔ قلم کا نہیں ہے اندازہ
مرا قلم نہیں کردار اس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے
مرا قلم نہیں اس نقب زن کا دست ۔ ہوس
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اس وزد ۔ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اچھالتا ہے
مرا قلم نہیں تسبیح اس مبلّغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی
جو اپنے چہرے پہ دہرا نقاب رکھتا ہے
مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لیے تو جو لکھا تپاک ۔ جاں سے لکھا

جبھی تو لوچ کماں کا زبان تیر کی ہے
میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصار ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا
سرشت عشق نے افتادگی نہیں پائی
تو قدِ سرو نہ بینی و سایہ پیمائی

اس نظم کو پڑھتے ہوئے وہ اپنے آپ میں اس قدر ڈوب جاتے تھے کہ انہیں آس پاس کا ہوش ہی نہیں رہتا تھا بلکہ وہ اس نظم کے دوران واہ واہ اور سبحان اللہ کے تعریفی کلمات بھی سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ چاہے کتنی ہی فرمائشیں کیوں نہ ہوں اپنی اس نظم کے اختتام کے بعد وہ کچھ اور کلام سنانا پسند نہیں کرتے تھے تا وقتیکہ دوسرا دور نہ شروع ہو جائے۔ ٹورنٹو ہی میں نہیں بلکہ اس کے بعد جہاں کہیں بھی میں نے ان سے یہ نظم کسی مشاعرے میں سنی تو انہیں ہمیشہ اسی عالم میں پایا۔

ہاں ایک بات میں نے محسوس کی تھی کہ جنرل ضیاالحق کے مرنے کے بعد جب وہ کسی مشاعرے میں اس نظم کو پڑھتے تھے تو ان کے انداز میں وہ جوش اور ولولہ نہیں ہوتا تھا جسے میں نے اور مجھ جیسے ہزاروں لوگوں نے ان کی جلاوطنی کے دوران محسوس کیا تھا۔ بلکہ بعد میں تو اس نظم کو پڑھتے ہوئے کسی کسی مشاعرے میں وہ معذرت خواہانا انداز میں یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ یہ نظم میں نے جن حالات میں کہی تھی

وہ حالات ہر چند کہ اب ویسے نہیں ہیں لیکن پھر بھی نہ ہمارے ملک کے حالات ہی بدلتے ہیں اور نہ ہی ہماری نظموں کے پس منظر بدلتے ہیں لہٰذا آپ سب کی فرمائش پر میں اسے سنائے دیتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

میں نے ایک بار ان سے پوچھا تھا کہ ان کی پسندیدہ نظم اور غزل کون سی ہے تو انہوں نے محاصرہ والی نظم اور "سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں" والی غزل کو قرار دیا تھا۔

محاصرہ والی نظم کے دو مصرعوں کے وزن پر ادبی حلقوں میں کچھ واجبی سی تنقید ہوئی تھی۔ 'بے آواز گلی کوچوں میں' یہ دو علاحدہ علاحدہ مصرعے کچھ یوں تھے۔

(۱) معززین عدالت حلف اٹھانے کو

(۲) مرا قلم نہیں اوزار اس نقب زن کا

ان دونوں مصرعوں کو انہوں نے بروزن طرف اور طلب باندھ دیا تھا۔ لیکن بعد میں انہی مصرعوں کو تبدیل کر کے خود ان کی تصحیح بھی یوں کر دی تھی۔

(۱) معززین عدالت بھی حلف اٹھانے کو

(۲) مرا قلم نہیں اُس نقب زن کا دست ہوس

لاکھ فراز کا تعلق کوہاٹ' نوشہرہ یا پشاور سے ہو لیکن اردو کے باب میں خصوصاً شاعری کے معاملے میں وہ اہل زبان سے بھی بڑھ کر اہل زبان تھے۔ لکھنو اور دہلی والوں سے بھی بڑھ کر لکھنوی اور دہلوی تھے۔ خود بھی درست زبان لکھتے تھے اور

تمام اردو لکھنے والوں سے چاہے ان کا تعلق کہیں سے بھی ہو درست اور صحیح زبان لکھنے کی توقع کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ان سے زبانی سنی ہوئی ایک بات میں یہاں دہرانا پسند کروں گا کہ جو انہوں نے فیض صاحب کے ایک مصرعے کے حوالے سے کی تھی۔ ان کی نظم کا ایک مصرعہ ان کے شعری مجموعے "مرے دل مرے مسافر" میں یوں شائع ہوا تھا:

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے وطنِ عزیز

تو فراز نے کہا کہ میں نے فیض صاحب سے کہا کہ یہاں وطن عزیز آپ نے ٹھیک نہیں باندھا ہے اسے یوں کر دیں تو بہتر ہوگا:

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن

اور فیض صاحب نے فراز کا یہ مشورہ مان بھی لیا۔ اب ان کی کلیات "نسخہ ہائے وفا" میں فراز کے مشورے سے یہ مصرعہ اپنی تبدیل شدہ شکل میں ہی شائع ہوا ہے۔

خیر یہ تو پرانی وضعداریوں اور علم دوستی کی باتیں تھیں۔ اب اگر صحتِ زبان پر اصرار کیا جائے تو اسے وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ جس طرح ایک بڑھئی یا مکینک اپنے اوزاروں کے بارے میں مکمل معلومات رکھنا چاہتا ہے اسی طرح ایک شاعر یا ادیب کو بھی جس زبان میں وہ لکھ رہا ہو اس کا پورا پورا علم رکھنا چاہیے یا کم از کم اس کی اہمیت کا احساس تو ہونا ہی چاہیے۔

زبان ایک بہتا ہوا دریا ہے اس کی شکلیں ہر جگہ، ہر مقام اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ اس کی قدیم اور مروجہ روایات پر بہت زیادہ اصرار بھی نہیں کرنا

چاہیے لیکن اس کے معینہ راستوں پر نظر ضرور رکھنی چاہیے تاکہ سفر کی اگلی منزلیں خوش اسلوبی سے طے ہوسکیں۔ زبان کے معاملے میں احمد فراز اسی نقطہء نظر کے قائل نظر آتے تھے۔

محاصرہ والی نظم کے پس منظر سے کون واقف نہیں لیکن پھر بھی ایک بار میں نے ان سے یوں ہی پوچھ لیا کہ کیا واقعی کسی غنیم وقت نے ان کو اس قسم کی سچ مچ کی دھمکی دی تھی یا یہ صرف زور تخیل والا معاملہ ہے تو انہوں نے بہت مسکراتے ہوئے کہا تھا کہ ویسے تو شاعری ہے ہی تخیل کی کارستانی لیکن اس نظم کے سلسلے میں یہ صرف تخیل والی بات نہیں ہے۔ واقعی مجھے اس قسم کا پیغام ایک بریگیڈیر کے ذریعے سے بھجوایا گیا تھا اور پھر اس کے بعد اسی نظم کا آدھا مصرعہ پڑھا کہ تمام صوفی و سالک......اور پھر ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی دوڑ گئی۔

جب جنرل ضیا الحق کا طیارہ تباہ ہوا تو ان دنوں وہ امریکہ میں ہی تھے۔ ان کا فون آیا کہ اشفاق خبر تو مل ہی چکی ہوگی۔ میں نے کہا ہاں یہ خبر تو اب پوری دنیا میں پھیل چکی ہے۔ کہنے لگے اور اس حادثے میں بریگیڈیر صدیق سالک بھی گیا۔ پھر ایک مصرعہ پڑھا:

سلام اُس پر کہ جس نے آم کی پیٹی میں بم رکھے

کچھ عرصے کے بعد میرا لاہور جانا ہوا تو وہاں پاک ٹی ہاؤس (جو اُن دنوں بخیریت تھا) میں کچھ دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے احمد فراز کے حوالے سے یہی مصرعہ دہرایا تو پروفیسر سہیل احمد خاں صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں لاہور

میں بھی ان دنوں ایک مصرعہ چل رہا ہے کہ:

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

کہنے لگے کہ ہم یہاں ساری عمر علامہ اقبال کو پڑھاتے رہے مگر ان کے اس مصرعے کے معنی اصل میں تو اب سمجھ میں آئے ہیں۔

کچھ یادیں کچھ باتیں

کہیں میں بھی مقامی شاعر نہ بن جاؤں:

احمد فراز اپنی زندگی آخری چوبیس پچیس سالوں میں کئی بار ٹورنٹو آئے۔ خصوصاً جلاوطنی کے دنوں میں تو کبھی کبھی ایک سال میں دو دو تین تین چکر لگ جاتے تھے۔ آخری برسوں میں اس رفتار میں کچھ کمی ہوئی مگر پھر بھی یہ سلسلہ رکا نہیں۔ اپنے بار بار یہاں مدعو کیے جانے پر اکثر وہ کہا کرتے تھے کہ اگر اسی تواتر سے میں یہاں آتا رہوں گا تو پھر مجھے ڈر ہے کہ میں بھی کہیں مقامی شاعروں کی صف میں نہ شامل ہو جاؤں۔ اب مقامی شاعر کا دکھ وہی سمجھ سکتا ہے جو اپنے ملک سے دور صرف اپنا سماجی مرتبہ بڑھانے کی غرض سے شاعری کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مقامی شاعر ایک لحاظ سے اپنے آپ کو کافی مظلوم محسوس کرتا ہے اس لیے کہ جب یہاں کوئی بین الاقوامی مشاعرہ منعقد ہوتا ہے اور اس میں مہمان شعرا کافی تعداد میں ہوتے ہیں تو پھر مقامی شاعر کو اپنا کلام بلاغت نظام سنانے کا موقعہ نہیں ملتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اس

کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں ہوتی - ایسا ٹورنٹو میں کم از کم متعدد بار ہوا ہے- احمد فراز کا اشارہ اسی طرف ہوتا تھا-

میں کراچی میں اردو بولتے ہوئے شرماتا تھا:

ایک دفعہ احمد فراز نے مجھے عجیب و غریب بات بتائی- کہنے لگے کہ جب میں ملازمت کے لیے پہلی بار سن پچاس کی دہائی میں پشاور سے ریڈیو پاکستان کراچی آیا تو مجھے وہاں اردو بولتے ہوئے بہت ہچکچاہٹ ہوتی تھی اور میں نجی محفلوں میں بھی زیادہ تر خاموش بیٹھا رہتا تھا کہ میں لکھتا تو خوب تھا لیکن بولنے میں خود اعتمادی نہ تھی- اس لیے کہ کراچی آنے سے پہلے میں زیادہ تر پشتو ہی بولتا تھا- پھر آہستہ آہستہ میرا اعتماد بحال ہوا- فراز صاحب جب یہ بات کہہ رہے تھے تو انہوں نے میری آنکھوں میں بے یقینی کے سائے لہراتے ہوئے ضرور دیکھے ہوں گے- جبھی تو وہ ہنس ہنس کے مجھے یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اس قدر شستہ، شیریں، صاف، موتیوں سے بھری ہوئی اور خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی زبان بولنے والے کی اس غیر متوقعہ بات پر آخر میں کیسے یقین کرلوں؟

پشاور سے اسلام آباد کا ایک سفر:

بے نظیر صاحبہ کی حکومت تھی اور ان دنوں احمد فراز اکادمی ادبیات کے چیئرمین تھے- میں پاکستان گیا تو سب سے پہلے کراچی سے سیدھا پشاور جانا ہو

گیا-وہاں محسن احسان اور خاطر غزنوی صاحب کے ساتھ رات کے کھانے پر ملاقات ہوئی تو ان سے پتہ چلا کہ فراز بھی اسی دن اسلام آباد سے پشاور آئے ہوئے ہیں-فون پر ان سے رابطہ ہوا تو کہنے لگے کہ میری اجازت کے بغیر چپکے چپکے میرے شہر میں کیسے آنا ہوا؟ میں نے کہا آپ کا شہر تو اسلام آباد ہے اب کل شام کو وہاں کے لیے روانگی ہوگی- کہنے لگے میں بھی کل ہی واپس جا رہا ہوں مگر میں ذرا جلدی نکلوں گا-تو پھر فلائٹ کو چھوڑیں اور ساتھ ہی گاڑی پر آپ بھی میرے ساتھ جلدی نکل چلیں-میرے لیے اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی-دوسرے دن وہ ڈین ہوٹل میں جہاں میرا قیام تھا' آ گئے اور ہم نے پشاور سے اسلام آباد تک ایک ساتھ سفر کیا-جب انہیں پتہ چلا کہ میں پہلی بار پشاور آیا ہوں تو انہوں نے قدرے افسوس کا اظہار کیا کہ میں صحیح طرح سے پشاور شہر نہ دیکھ سکا- ڈین ہوٹل سے نکلتے ہی انہوں نے کہا کہ کچھ اور پہلے اگر آپ یہاں آئے ہوتے تو اس ہوٹل کی شان دیکھتے-پھر انہیں اس ہوٹل کا ایک واقعہ یاد آ گیا- کہنے لگے کہ ایک بار فیض صاحب کسی مشاعرے کے سلسلے میں پشاور آئے ہوئے تھے-مشاعرے کے دوسرے دن اچھے موڈ میں تھے کہنے لگے فراز آؤ آج ہم خود اپنے پیسے سے شراب پیتے ہیں-میں نے کہا مشاعرے سے جتنی آمدنی آپ کو ہوئی ہے اس سے ذرا سی کم مجھے بھی ہوئی ہے مگر اتنی ہے کہ میں آپ کی میزبانی تو کر سکتا ہوں-ان دنوں پاکستان میں اس طرح کا لولا لنگڑا اسلامی نظام نہیں آیا تھا عموماً اچھے ہوٹلوں میں بار ضرور ہوا کرتے تھے-فیض صاحب نے آرڈر دیا اور ہم لوگ شغل کرنے لگے-یہ وہ زمانہ تھا جب انہیں لینن امن

انعام مل چکا تھا اور وہ شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ اٹھنے سے پہلے جب بیرے سے بل لانے کو کہا گیا تو اس نے کہا "سر آپ کا بل پہلے ہی ایک صاحب نے ادا کر دیا ہے"۔ فیض صاحب نے کہا لو بھئی فراز آج بھی ہم لوگ اپنے پیسوں سے نہیں پی سکے۔ یعنی ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔

کراچی اچھا لگتا ہے:

سفر کے دوران پشاور کی بہت سی باتیں ہوئیں۔ دوران گفتگو میرے منہ سے نکلا کہ مجھے پاکستان کے شہروں میں سب سے زیادہ لاہور شہر پسند ہے تو فراز نے بغیر میرے پوچھے ہوئے کہا کہ لیکن مجھے ہمیشہ سے کراچی پسند ہے۔ پھر وہ کراچی کے بارے میں خصوصاً پچاس کی دہائی کے کراچی کے بارے میں بہت محبت بھرے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ انہیں اس دور کا کراچی بہت پسند آیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ ان دنوں کراچی میں ہونے والی لسانی سیاست کے بارے میں اپنی مکمل ناپسندیدگی کے اظہار کے ساتھ ساتھ ماضی میں وہاں ہونے والے لسانی فسادات پر بھی افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ سندھ میں سندھی زبان کے مکمل حقوق کی بات کرتے ہوئے پوچھ رہے تھے کہ اگر سندھ میں سندھی زبان نہیں بولی جائے گی تو پھر کہاں بولی جائے گی؟ ان کے ایک ایک لفظ سے سندھی زبان کے لیے محبت کا اظہار ہو رہا تھا اور میں ان کے اس پر خلوص تجزیے کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دراصل ان کا ایک قوم پرستانہ نقطۂ نظر تھا- وہ پاکستان کے سیاسی ٗسماجی اور ثقافتی مسئلوں کو اسی انداز سے دیکھتے تھے- انہیں بے حد رنج تھا کہ وہ جس صوبے کے رہنے والے تھے اس کا کوئی نام کیوں نہیں ہے؟ شمال مغربی صوبہ سرحد ٗ انگریزوں کا دیا ہوا یہ نام انہیں بالکل پسند نہ تھا- وہ کہہ رہے تھے کہ بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا- یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی انسان کا دھڑ ہو مگر اس کا چہرہ نہ ہو- وہ بڑے جذباتی انداز میں کہہ رہے تھے اگر کسی کو پشتون یا پختون خواہ پسند نہیں ہے تو بابا کوئی اور نام دے دو- مجھے میرا چہرہ چاہیے- اسی طرح کی اور بہت سی باتوں میں وقت گزر گیا اور میں سوچنے لگا کہ واقعی سچ ہی تو کہا گیا ہے کہ آدمی سفر کے دوران کھلتا ہے- اتنی بہت سی باتوں کے درمیان ہی اسلام آباد کے نواحی علاقے نظر آنے لگے اور گفتگو کا یہ سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے رک گیا-

میزبان اور مہمان:

مجھے اسلام آباد پہنچ کر کسی ہوٹل میں ٹھہرنا تھا لیکن فراز صاحب نے ایسا نہ کرنے دیا اور آنے والے دو دن جو مجھے اپنے پروگرام کے مطابق اسلام آباد میں گزارنے تھے وہ دونوں دن میں فراز صاحب کے گھر ہی پر مہمان رہا- انہوں نے ازراہ دوستی و سرپرستی ایک آدھ جگہ اس کا ذکر بھی کیا کہ مجھ میں اور اشفاق میں ایک بات یہ بھی مشترک ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مہمان بھی رہے ہیں اور میزبان بھی- میں ہر چند کہ ان کے گھر پر صرف ایک بار ہی ٹھہرا ہوں لیکن دل لگتی بات تو یہی ہے کہ

میرے لیے یہ بہر حال یہ دونوں ہی باتیں باعثِ اعزاز تھیں اور ہمیشہ ہی باعثِ اعزاز رہیں گی۔ ان کے منہ سے جب یہ جملے ادا ہوتے تھے ان میں شفقتوں اور محبتوں کی مٹھاس گھل جاتی تھی۔

صبح سویرے اٹھنے کی عادت:

میں نے اپنے گھر میں بھی اور خود فراز صاحب کے گھر میں بھی دیکھا کہ وہ بہت سویرے اٹھنے اور پیدل چلنے کے عادی تھے۔ میرا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے اور یہ بات انہیں اچھی طرح سے معلوم تھی۔ چنانچہ جب وہ میرے یہاں قیام کرتے تھے تو دروازے کی چابی اور باورچی خانے کی میز پر ان کے لیے چائے بنانے کا سامان انتہائی شرمندگی کے باوجود رکھ دیا جاتا تھا۔ میں ان کے گھر جب پہلی بار سو کر اٹھا تو فراز صاحب کے ہاتھوں میں چائے کی پیالی دیکھی۔ کہنے لگے مجھے آٹھ بجے دفتر پہنچنا ہے ابھی سات بجے ہیں آپ بھی میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اور واقعی وہ دفتر کے وقت سے کچھ قبل ہی وہاں پہنچ گئے۔ جتنا میں جانتا ہوں اس کے مطابق وہ جب اسلام آباد میں ہوتے تو دفتر میں ہمیشہ وقت پر ہی پہنچتے تھے۔

اُن کے صبح سویرے اٹھنے کا پہلا مشاہدہ مجھے ۱۹۸۲ء میں لاس اینجلس میں ہوا جہاں نیر جہاں صاحبہ نے مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ اس مشاعرے میں احمد فراز اور افتخار عارف لندن سے تشریف لائے تھے۔ ان دونوں کے رہنے کا انتظام

احمد جعفری کے گھر پر کیا گیا تھا۔ احمد ان دنوں اکیلے ہی رہتے تھے چنانچہ جب میں ٹورنٹو سے وہاں پہنچا تو احمد نے مجھے بھی اپنے گھر پر ہی ٹھرالیا۔ اس امید پر کہ جب وہ دفتر چلے جائیں گے تو کم از کم مہمانوں کو صبح کا ناشتہ تو مل ہی جائے گا۔ اس دن جب ہم لوگ رات کا کھانا کھا کر واپس لوٹے تو احمد تھوڑی دیر بعد سونے چلے گئے اور ہم لوگ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

بہت اچھا ماحول تھا رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی اور رات کے آخری پہر ہم لوگ بھی سونے چلے گئے۔ دوسری صبح میری آنکھ ایسے کھلی کہ دونوں میرے منہ پر پانی ڈال رہے تھے اور باقاعدہ میرے بستر کی چادر کھینچ کر مجھے اٹھا رہے تھے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ مجھ سے بھی پہلے سو کر اٹھ جائیں گے۔ اُس دن پتہ چلا کہ افتخار عارف اوّل وقت نماز صبح پڑھنے اور احمد فراز صبح کی چہل قدمی کے لیے اٹھنے والوں میں سے ہیں۔ شرمندگی تو بہت ہوئی کہ میری نالائقی کی وجہ سے بیچارے صبح سے ایک پیالی چائے پی کر ابھی تک ناشتے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں لیکن کیا کیا جا سکتا تھا۔

غالب بنام آورم:

غالب کی شاعری سے احمد فراز کو جنون کی حد تک عشق تھا۔ ان کی کلیات میں جا بجا غالب کی زمینوں میں کہی ہوئی غزلیں ملتی ہیں۔ کہیں ان کی زمینوں میں قافیوں کو تبدیل کر کے غزلیں ملتی ہیں تو کہیں ردیفوں میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے

انہوں نے بہت خوب صورت غزلیں کہی ہیں۔ اس سلسلے میں صرف ایک مثال ہی کافی ہوگی۔ غالب نے کہا تھا

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

تو فراز نے اسی کی ردیف میں ذرا سی تبدیلی کر کے اپنی پسندیدہ غزل یوں کہی:

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

پھر اس کے قافیہ میں تبدیلی کرتے ہوئے ایک اور غزل کہی:

ابھی کچھ اور کرشمے غزل کے دیکھتے ہیں
فراز اب ذرا لہجہ بدل کے دیکھتے ہیں

ردیف میں ذرا سی تبدیلی کر کے ایک اور غزل یوں کہی۔

مسافرت میں بھی تصویر گھر کی دیکھتے ہیں
کوئی بھی خواب ہو تعبیر گھر کی دیکھتے ہیں

اور پھر غالب کی زمین میں تو غزل کہنی ہی تھی سو یوں کہی:

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں
فراز ہم سے سخن دوست فال کے لیے بھی
کلامِ غالبِ آشفتہ سر کو دیکھتے ہیں

فال کے لیے بھی دیوان حافظ کے بجائے کلامِ غالب ہو آشفتہ سر کو دیکھنے والے شاعر احمد فراز کا کہنا تھا کہ زندگی کی کوئی بھی سچوایشن ہو غالب کے یہاں اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی شعر ضرور مل جائے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ آپ کو غالب پوری طرح سے یاد ہو۔

ایک دن میرے گھر دعوت پر شان الحق حقی صاحب کی موجودگی میں بھی انہوں نے یہی بات کہی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ امریکہ کے کسی شہر میں دوستوں کا مجمع تھا۔ شغل میکشی کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی باتوں اور لطیفوں کا دور چل رہا تھا۔ وہاں کسی صاحب نے یا خود فراز نے ایک لطیفہ سنایا جو کچھ یوں تھا کہ ایک آدمی چڑیا گھر میں کام کرتا تھا۔ ایک دن صبح سے شام تک بارش ہوتی رہی۔ سڑکوں پر پانی بھر جانے کی وجہ سے ٹریفک بند ہو چکا تھا۔ اس بیچارے نے سوچا کہ رات بہت ہو چکی ہے کون اس مصیبت میں گھر جائے تو چلو آج رات یہیں پر سو لیتا ہوں۔ صبح سویرے اس کی بیوی اُسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچی تو دیکھا کہ وہ شیر کے پنجرے کے ساتھ ہی پڑا سو رہا ہے۔ بیوی نے اسے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا ''بزدل ' بیوی کے ہوتے شیر کے پاس سو رہا ہے''۔ سب لوگ ہنسنے لگے تو ایک صاحب نے کہا فراز ابھی کچھ دیر پہلے آپ کہہ رہے تھے کہ اگر کسی کو غالب یاد ہو تو زندگی کی ہر سچوایشن پر کوئی نہ کوئی شعر ضرور مل جائے گا۔ تو کیا اس سچوایشن کا بھی شعر غالب کے دیوان میں ہے؟

فراز کہنے لگے کہ ایک لمحے کے لیے تو میں شش و پنج میں پڑ گیا لیکن پھر

مجھے فوراً غالب کا ایک شعر یاد آ گیا اور میں نے کہا کہ ہاں کیوں نہیں- اور میں نے یہ شعر پڑھ دیا:

دہن ۔ شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل
نہ کھڑے ہوجیے خوبان دل آزار کے پاس

کہنے لگے اشفاق میں بتا نہیں سکتا کہ اُس وقت یہ شعر مجھے یاد آیا تو کتنی خوشی ہوئی تھی- ابھی وہ یہ واقعہ مزے لے لے کر سنا ہی رہے تھے کہ حقی صاحب نے کہا یہ بات شکسپیر کے لیے تو کہی جا سکتی ہے غالب کے لیے نہیں- ہم لوگ سمجھے کہ اب کوئی بدمزگی نہ شروع ہو جائے کیوں کہ دو دو تین تین دور ہو چکے تھے- ایک طرف ایک دلّی والا تھا تو دوسری طرف ایک مردِ کہستاں جو غالب کے اس مصرعے کی تفسیر بنا ہوا تھا کہ: . ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں-

فراز کو تھوڑا سا تاؤ آیا مگر وہ شراب کے گھونٹ میں اسے بھی پی گئے- صرف اتنا کہا کہ ہم نے شکسپیر ویکسپیر کو نہیں پڑھا ہے جس کو پڑھا ہے اس کی بات کریں- لوگوں نے کوئی دوسری بات شروع کر دی- تھوڑی دیر بعد کسی صاحب کے ذکر پر حقی صاحب نے فراز سے کہا میرے پاس ان صاحب کا ای میل ایڈریس نہیں ہے اگر آپ کے پاس ہو تو مجھے دے دیں- فراز مسکراتے ہوئے کہنے لگے حقی صاحب جس طرح آپ غالب کے بجائے شکسپئر کے قائل ہیں اسی طرح میں بھی کسی ای میل ایڈریس کے بجائے صرف شی میل ایڈریس کا قائل ہوں- حقی صاحب بھی مسکرانے لگے- بات ہنسی مذاق میں ختم ہوگئی مگر اب میں سوچتا ہوں کہ ان کے اندر ایک بہت ہی

پُر مزاح اور کھلنڈری شخصیت چھپی ہوئی تھی- وہ اس مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے جن کا ایمان تھا کہ جان جائے تو جائے مگر کوئی جملہ بیکار نہ جائے-

بغیر پاسپورٹ کے امریکہ میں داخلہ:

شان الحق حقی صاحب کا ذکر آ گیا ہے تو احمد فراز کے حوالے سے ان کے بیٹے کیپٹن شایان حقی کا بھی ایک واقعہ سنانے کا جی چاہتا ہے- یہ واقعہ مجھے مانٹریال کی ایک فعال سماجی شخصیت علی عباس حسنی نے پوری تفصیل سے خود سنایا تھا- ہوا یہ کہ فراز مانٹریال سے نیویارک جا رہے تھے- عباس حسنی انہیں ایرپورٹ پہنچا کر واپس گھر ہی آئے تھے کہ تھوڑی دیر بعد فراز کا فون آ گیا کہ مجھے کسٹم والوں نے روک لیا ہے اور امریکہ نہیں جانے دے رہے ہیں کہ میرے پاس وزٹ ویزا ہے جبکہ مجھے بزنس ویزا چاہیے- علی عباس حسنی نے جب کسٹم آفیسر سے بات کی تو پتہ چلا کہ فراز نے خود انہیں بتایا تھا کہ بوسٹن میں ان کی کتاب کی لانچنگ ہے اور اس سے کچھ انکم بھی ہوگی- جس پر کسٹم آفیسر نے کہا کہ تمہارے پاس تو گھومنے پھرنے کا ویزا ہے اور تم تو آمدنی کرنے جا رہے ہو لہٰذا بزنس ویزا لے کر آؤ- بزنس ویزا ملنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا- لہٰذا کیپٹن شایان حقی سے مدد مانگی گئی جنہیں مانٹریال سے فلائنگ کا لائسنس مل چکا تھا- اور وہ اکثر بارڈر کے دوسری طرف جہاز چلا کر جایا کرتے تھے اور وہاں کنٹرول ٹاور میں ان کی جان پہچان بھی تھی- انہوں نے کہا کہ فراز کے پاس امریکہ کا وزٹ ویزا تو ہے سو میں یہ کر سکتا ہوں کہ انہیں بارڈر کے پاس ایک چھوٹے

سے ایرپورٹ پر اتار دیتا ہوں وہاں سے وہ خود بس لے کر بوسٹن چلے جائیں گے۔
رات ہونے والی تھی شایان نے جہاز بک کیا اور احمد فراز' ان کے پبلشر منصور عثمانی
ور علی عباس حسنی کو لے کر بارڈر کے دوسری طرف ایک چھوٹے سے ایرپورٹ پر
پہنچے۔ وہاں وائرلیس پر ہی ڈیوٹی آفیسر نے پوچھا کتنے لوگ ہیں اور کیا سب کے پاس
کاغذات ہیں۔ اس کے بغیر جہاز اتر نہیں سکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ احمد فراز اپنا
پاسپورٹ وہیں گھر پر بھول آئے ہیں۔ مرے پر سو دُرّے۔ یہ ایک بڑی مصیبت تھی
گر آفیسر ذرا سخت ہوتا تو شایان کا لائسنس تک ضبط ہو سکتا تھا۔ شایان نے کمال
ہوشیاری سے کہا کہ میں ابھی لینڈ نہیں کروں گا دوبارہ واپس آتا ہوں۔ آفیسر نے کہا
مگر ڈیڑھ گھنٹے میں ایرپورٹ بند ہو جائے گا۔ اب ایک مصیبت اور سامنے تھی اس
لیے کہ بغیر پاسپورٹ کے کینیڈا میں بھی کیسے اترا جائے۔ شایان نے مین ایرپورٹ
کے بجائے ایک چھوٹے سے ایرپورٹ پر جہاز اتارا۔ وہاں کے آفیسران کو اچھی
طرح جانتے تھے۔ ان سے شایان نے یہی کہا کہ ہم ابھی یہاں سے اڑے تھے اور
اب بس واپس اترنا چاہتے ہیں۔ اجازت مل گئی اور خدا خدا کر کے یہ مصیبت بھی مل
گئی۔ اب دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ فراز کا پاسپورٹ فوراً مل جائے۔ شکر ہے کہ ان کا
پاسپورٹ گھر پر ہی مل گیا۔ دوبارہ یہ لوگ امریکہ پہنچے۔ ایرپورٹ بند ہونے میں چند
منٹ باقی تھے۔ فراز کو وہاں رات کی تاریکی میں اتار کر یہ لوگ واپس آئے۔

عباس حسنی نے مجھے تو یہ باتیں خاصی تفصیل سے اور پورے ڈرامائی
انداز میں بتائی تھیں مگر میں نے اس پوری کہانی کو یہاں مختصراً بیان کیا ہے۔ جب وہ بتا

رہے تھے تو ایسا لگتا تھا جیسے کوئی فلم دیکھی جا رہی ہو۔ شکر ہے کہ یہ واقعہ آج سے پچیس سال پہلے کا ہے اگر نائن الیون کے بعد کا واقعہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا؟ مگر میرے ذہن میں جب بھی یہ واقعہ آتا ہے تو سوچتا ہوں کہ احمد فراز کو کیسے کیسے بے پناہ محبت کرنے والے لوگ ملے؟

پاسپورٹ کا اجرا:

اُن سے بے پناہ محبت کرنے والوں میں ایک شخص وہ بھی تھا جس کی پوسٹنگ اُن دنوں نیویارک کے پاکستان کونسلیٹ میں تھی۔ فراز اس کا ذکر بہت احسان مندی سے کرتے تھے۔ وہ جب وطن سے نکلے تھے تو انہیں کیا خبر تھی کہ جلاوطنی کا یہ دور اتنا طویل ہو جائے گا۔ ان کے پاسپورٹ کی مدت ختم ہوئی تو نئے پاسپورٹ کا اجرا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا تھا۔ خصوصاً برطانیہ میں تو یہ تقریباً ناممکن تھا۔ مگر نیویارک میں ان کے ایک چاہنے والے یہ کام بھی چھپ چھپا کے کر دیا۔ بعد میں جب اس آفیسر کی باز پرس ہوئی تو اس نے کہا میں نے تو احمد شاہ کے پاسپورٹ کا اجرا کیا تھا مجھے کیا پتہ تھا کہ احمد فراز ہی اصل میں احمد شاہ ہیں۔ میں سوچتا ہوں ان سب واقعات میں فراز کی خوش قسمتی کا کتنا دخل تھا۔؟

وفاداری بہ شرطِ استواری:

جس دن جنرل ضیاالحق نے پاکستان میں آٹھویں ترمیم کا بل پیش کیا اور اس میں اٹھاون بی کا تعارف کراتے ہوئے اپنے تمام سیاہ کارناموں پر پردہ ڈالنا

چاہا تو اُس دن احمد فراز یہاں ٹورنٹو میں تھے۔ یہاں کے ترقی پسند ساتھیوں کی تنظیم کمیٹی آف پروگریسو پاکستانیز نے پاکستان کونسلیٹ کے سامنے احتجاجی مظاہرے کا پروگرام بنایا تو اس احتجاجی مظاہرے میں احمد فراز بھی اپنے ہاتھوں میں بینر اٹھائے ہوئے ان تمام ساتھیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے جو پاکستان میں مارشل لا اور ضیا کی آمریت کے خلاف مسلسل جدوجہد میں مصروف تھے۔ ان کے اندر ایک متحرک اور باضمیر انسان ہمیشہ کروٹیں لیتا رہتا تھا جبھی تو زندگی کے آخری دنوں میں بھی اسلام آباد میں جنرل مشرف کے خلاف ہونے والے وکلا کے احتجاجی لانگ مارچ میں وہ صحت کی خرابی کے باوجود شامل ہوئے۔ اسی طرز زندگی اور اپنے نظریے پر ثابت قدمی کو ہی کو تو غالب نے وفاداری بشرطِ استواری کہا ہے۔

ٹورنٹو میں پہلا جشن فراز

مانٹریال کے ایک پبلشر منصور عثمانی نے احمد فراز کا نیا شعری مجموعہ ''نابینا شہر میں آئینہ'' کے نام سے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا تھا جس کی تقریبِ رونمائی رائٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈینز کی جانب سے ٹورنٹو میں منعقد کی گئی تھی- لیکن یہ صرف ایک کتاب کی تقریبِ رونمائی ہی نہیں تھی بلکہ دراصل اسے جشن احمد فراز کہنا زیادہ صحیح ہوگا-

ہوا یہ تھا کہ اسی سال جنرل ضیاالحق نے کینیڈا کا دورہ کیا تھا- ٹورنٹو میں اُس وقت تک پاکستان کا قونصل خانہ نہیں کھلا تھا لہٰذا آٹوا کے سفارت خانے نے یہاں کے چند معززین کی طرف سے جنرل کے اعزاز میں ٹورنٹو کے ایک بہت بڑے ہوٹل رائل یارک میں استقبالیہ تقریب منعقد کی تھی- اس موقعہ پر یہاں کے جمہوریت پسند اور ترقی پسند ساتھیوں نے مل کر ہوٹل کے سامنے ایک احتجاجی مظاہرہ بھی کیا تھا- ہم لوگوں نے سوچا کہ کیوں نہ اسی ہوٹل میں اگلے ہفتے آپس میں چندہ کر کے اُس

پیمانے کا نہ سہی لیکن چھوٹا سا ہی کوئی پروگرام کر لیں۔ خوش قسمتی سے احمد فراز کی کتاب انہی دنوں شائع ہوئی تھی لہٰذا طے یہ پایا گیا کہ اس کتاب کی تقریب رونمائی اور جشن فراز اسی ہوٹل میں ضیا الحق کے جلسے سے اگلے ہفتے منعقد کیا جائے۔ سو یہ ایک بہت منفرد اور یادگار ادبی تقریب احمد فراز کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی۔ اس موقعہ پر میں بھی نے ایک مختصر سا مضمون پڑھا تھا جسے یہاں نقل کر رہا ہوں کہ اس تقریب کی یاد تازہ ہو جائے۔

شہرِ فراز کے کرداروں کا المیہ

فیض نے کہا تھا

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل

فیض نے جس شہر کے کرب کی نشاندہی کی تھی وہی کرب وہی، بدنصیبی وہی، بے حسی اور وہی نامرادی شہر فراز کی پہچان بھی ہے اور اس کا المیہ بھی۔

جب احمد فراز کا نیا مجموعہ کلام بے آواز گلی کوچوں میں شائع ہوا تو میرا پہلا تاثر یہی تھا کہ فراز کے یہاں بے آواز گلی کوچوں کا تصور صرف خوبصورت امیجری بنانے کے لئے نہیں ہے، یہ عالم سرشاری میں لکھی گئی کسی نظم کی لائین بھی نہیں ہے اور نا ہی صرف کتاب کے سرورق کو معنوی حسن دینے کی کوئی شعوری کوشش ہے بلکہ مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ بے آواز گلی کوچے دراصل جیتے جاگتے محلے ہیں اور ایسے کئی محلّے مل کر ایک ایسے شہر کو جنم دیتے ہیں جہاں تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد

بستے ہیں۔ ان میں دفتروں میں کام کرنے والے سفید پوش کلرک بھی ہیں اور چلچلاتی دھوپ میں اپنے پسینے میں نہانے والے کسان بھی ہیں۔ جیل کی کوٹھریاں بھی ہیں اور بے جرم صعوبتیں برداشت کرنے والے معصوم چہرے بھی ہیں۔ ان گلیوں محلوں اور شہروں میں بسنے والے لوگ سچائی کے امین بھی ہیں اور کذب وریا کے پیکر بھی ہیں اس شہر کی کیاریوں میں درد کے گلاب بھی کھلتے ہیں اور خون کی بارشیں بھی ہوتی ہیں ان شہروں میں خطیبوں واعظوں اور دستار فضیلت رکھنے والوں کے گروہ بھی ہیں اور بے ضمیری کے لبادے میں ملبوس بے حسی کے مجسمے بھی ہیں۔ غرض یہ کہ زندگی کے مختلف کردار ہیں جو شہر فراز کے گلی کوچوں میں سانس لیتے ہوئے اور چلتے پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

فراز نے ہمیں ان کرداروں کے نام نہیں بتائے لیکن ان کرداروں کی پہچان ضرور کروائی ہے یہی وہ کردار ہیں جن کے چہروں سے نقاب اٹھاتے ہوئے فراز کی شاعری کبھی کبھی غصے اور تلخ نوائی کی کیفیت سے دوچار ہوتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی شاعری کا یہی وہ خوبصورت اور جاندار حصہ ہے جو شہر فراز میں بسنے والے سادہ دل اور عام لوگوں کے لئے انکے دکھوں کا نشتر بھی ہے اور مرہم بھی۔ شہر فراز کے کردار زیادہ تر کردار المیاتی کردار ہیں اور یہی المیاتی کردار فراز کی شاعری کے ایک بڑے حصے کو اپنے پروں میں سمیٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔

''بے آواز گلی کوچوں میں'' اور پھر اسکے بعد ''نابینا شہر میں آئینہ'' کے ذریعے اس المیے کے کئی پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔

فراز نے اپنے شہر اور اس شہر کے لوگوں کی کیفیت کے بارے میں "بے آواز گلی کوچوں میں" لکھا تھا

سارا شہر بلکتا ہے
پھر بھی کیسا سکتہ ہے
ہر کوئی تصویر نما
دور خلا میں تکتا ہے
گلیوں میں بارود کی بو
یا پھر خون مہکتا ہے
سب کے بازو بیخ بستہ
سب کا جسم دہکتا ہے
ایک سفر وہ ہے جس میں
پاؤں نہیں دل تھکتا ہے

اور "نابینا شہر میں آئینہ" اسی ستم رسیدہ شہر کی انتہائے بے بسی کی تصویر کو کچھ یوں پیش کرتا ہے۔

نہ یوں کہ آغازِ فصلِ گل میں
خوشیاں کوئی گیت گائیں
نہ یوں کہ مجبور جنگلوں میں
اداس جگنو دیے جلائیں

نہ یوں کہ خندہ دلی سے روئیں
نہ یوں کہ رو رو کے مسکرائیں
نہ کوئی منظر کہ آشنا ہو
تو ہمدمی کا فریب کھائیں
نہ کوئی اپنا جو غیر سا ہو
کہ جس کو تیرے سخن سنائیں

یہ ایک ایسے شہر کا نقشہ ہے جس کے مکین زندہ تو ہیں لیکن زندگی کے حسن سے محروم ہیں' جن کے چہروں پر آنکھیں تو ہیں لیکن بصارتوں سے عاری ہیں' جن کے منہ میں زبانیں تو ہیں لیکن حسنِ تقریر سے نا آشنا ہیں۔ یوں ہے کہ یہ شہر جبر کے آہنی شکنجوں میں کراہتا ہوا نظر آتا ہے اور فراز نے اسی شہر کی نوحہ گری کو نغمہ گری میں تبدیل کر دیا ہے۔

ہر راہ میں تیرا ہم سفر ہوں
اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں

ایسے میں اگر کوئی فراز سے یہ کہے کہ اس شہر کی نوحہ گری چھوڑ کر حالات کے سامنے سر جھکا دو اور صرف سر ہی نہیں بلکہ قلم کا پرچم بھی سرنگوں کر دو تو فراز کا اپنے ان بہی خواہوں کے لیے یہی طنز بھرا اور پر درد جواب ہے کہ۔

ہم سے کہیں کچھ دوست ہمارے مت لکھو
جان اگر پیاری ہے پیارے مت لکھو

حاکم کی تلوار مقدس ہوتی ہے
حاکم کی تلوار کے بارے مت لکھو
کہتے ہیں یہ دار و رسن کا موسم ہے
جو بھی جس کی گردن مارے مت لکھو
وہ لکھو بس جو بھی امیر شہر لکھے
جو کہتے ہیں درد کے مارے مت لکھو
دل کہتا ہے کھل کر سچی بات لکھو
اور لفظوں کے بیچ ستارے مت لکھو

مصلحتوں کا تقاضا ہے کہ وہ لکھو جو امیر شہر کہے اور دل کی یہ آرزو کہ کھل کر سچی بات لکھو۔ اسی دوراہے پر فراز کی شاعری اپنی سمت اور منزل کا تعین کرتی ہے۔ اور پھر دیکھنے والی آنکھیں فراز کے کلام میں وہ تحریریں نہیں دیکھ پاتیں جو امیر شہر کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوں یا اس کے مصنوعی قصیدوں سے لبریز ہوں۔ بلکہ اس کے یہاں امیر شہر کے بجائے غریب شہر کے رنج یا بیان اور اس شہر کے غموں کا ذکر زیادہ نکھرے ہوئے انداز میں ملتا ہے۔ اور اس طرح پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسا شہر آ جاتا ہے جو چیخ چیخ کر ہر لمحہ محسوس کرنے والے دلوں پر نشتر لگاتا رہتا ہے۔

شاعری اور اس کے فن سے قطع نظر ہم ذرا سوچیں کہ آخر یہ کیسا شہر ہے جس کے در و دیوار پر زنداں کی فصیلوں کا گماں گزرتا ہے۔ جس کی ہواؤں میں بارود کی بو ہے اور جس کے رستوں پر جا بجا انسانی خون کے چھینٹوں کی گلکاریاں ہیں؟

اس شہر کی تلاش کا عمل براہ راست سیاست کے دائرے سے تعلق رکھتا
ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جب ہم شاعری' ادب یا کسی بھی فن لطیف کے
حوالے سے گفتگو کرتے ہیں تو سیاست کا لفظ ایک انسانی فریضہ' ایک اخلاقی قدر اور
شعور و آگہی کے چشمے کا نام بھی ہوتا ہے۔ احمد فراز کی شاعری سیاسی شعور اور آگہی کے
انہیں حوالوں اور جذبوں سے لبریز ہے۔ یہی سیاسی شعور اس کو ایک فرد' ایک محلے اور
ایک شہر یا ایک ملک اور اس کے لوگوں کے دکھ درد کو سمجھنے اور سمجھانے کا حوصلہ دیتا ہے۔
یوں ایک لکھنے والے کے یہاں سیاسی اور احتجاجی شاعری کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔
سیاسی اور احتجاجی شاعری کی انہی کرنوں کے نتیجے میں دربدری کے عذاب احمد فراز کے
جسم سے لباسِ تعذیر بن کر لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ جلاوطنی کی کئی صبحوں اور
شاموں کے بعد وہ اپنے شہر کے آنے والوں سے پوچھتا ہے کہ:

وہ شہر جو ہم سے چھوٹا ہے اب اس کا نظارہ کیسا ہے
سب دشمن جاں کس حال میں ہیں ہر جان سے پیارا کیسا ہے
شب بزم حریفاں جمتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں
یاروں کی بسر اوقات ہے کیا ہر انجمن آرا کیسا ہے
جب بھی میخانے بند ہی تھے اور وا در زنداں رہتا تھا
اب مفتی دیں کیا کہتا ہے موسم کا اشارا کیسا ہے
میخواروں کا پندار گیا اور ساقی کا معیار گیا
کل تلخی مے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارا کیسا ہے

"نابینا شہر میں آئینہ" کی یہ نظم صرف اتفاقی طور پر شہر کے بارے میں نہیں ہے بلکہ اس کے ہر ہر شعر میں اُس شہر اور اس سے دوری کا دکھ اور ملال ہے۔ یہ دکھ اور یہ ملال احمد فراز کے نئے شعری مجموعے میں شروع سے آخر تک نظر آتا ہے۔

احتیاط اہل محبت کہ اسی شہر میں لوگ
گل بدست آتے ہیں اور پابہ رسن جاتے ہیں
ساقیا تونے تو میخانے کا یہ حال کیا
بادہ کش محتسب شہر کے گن گاتے ہیں

میخانوں پر عذاب وثواب کے دور تو آتے ہی رہتے ہیں لیکن جب بادہ کش بھی محتسب شہر کے گن گانے لگیں تو بگڑی ہوئی صورت حال کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔

فضا بے ابر شاخیں بے ثمر ہیں
پرندوں سے شجر محروم تر ہیں

سرو و صنوبر شہر کے مرجاتے ہیں
سارے پرندے ہجرت کرجاتے ہیں

اب لوگ جو دیکھیں گے تو خواب اور طرح کے
اس شہر پہ اتریں گے عذاب اور طرح کے

ایسی نفرت تھی کہ اس شہر کو جب آگ لگی
ہر بگولہ خس و خاشاک پہن کر نکلا

یہ روح فرسا مناظر دیکھ کر فراز نے ایک لمحے کو آنکھیں موند لیں اور کہا کہ ہم نے اس کے شہر کو چھوڑا اور آنکھوں کو موند لیا۔ لیکن ایسا نہیں ہے فراز نے اپنی آنکھیں موندیں تو کیا پلکیں تک نہیں جھپکائیں بلکہ بڑے بانکپن سے کہا

میں نے تو تن بدن کا لہو نذر کر دیا
اے شہر یار تو بھی تو اپنا حساب دے
اب جو بھی حال کوئے ستم گر میں ہو فراز
اب جو بھی بدعا دل خانہ خراب دے

میں نے تو تن بدن کا لہو نذر کر دیا اور اب جو بھی حال کوئے ستم گر میں ہو فراز۔ اس قسم کے مصرعے حالات سے آنکھیں موند کر نہیں بلکہ سیاسی شعور کی پختگی کے نتیجے ہی میں تحریر کئے جا سکتے ہیں۔ فراز نے اپنے شہر کے حالات کو اپنے سیاسی شعور کی روشنی میں دیکھا ہے آیئے اسی روشنی کے سہارے اس شہر میں داخل ہونے کی کوشش کریں جو فراز کے اشعار میں ایک جیتا جاگتا شہر ہے مگر اس شہر میں کیسے داخل ہوا جائے فراز نے تو "بے آواز گلی کوچوں میں" کہا ہے

میرے شہر کے سارے رستے بند ہیں لوگو

اور ان بند رستوں کی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے

لیکن میرے شہر کے سارے رستوں پر
اب باڑ ہے لوہے کے کانٹوں کی
شہ دروازے پر کچھ پہرے دار کھڑے ہیں

شہ دروازے پر کھڑے پہرے داروں سے پنجہ آزمائی کے نتیجے میں ہی صرف ایسے اشعار کہے جا سکتے ہیں جو کردار کی استقامت اور جذبات کی صداقت پر اساس رکھتے ہوں۔ شہ دروازوں اور فصیلوں سے ادھر دوسری جانب جب احمد فراز کی نگاہیں جاتی ہیں تو شہر میں ہر طرف عجیب سراسیمگی اور ہو کا عالم طاری نظر آتا ہے۔

چار سو اک فصیل بے در ہے
چار جانب حصار بے انداز
توڑ دیتی ہے سلسلے سارے
پہرے داروں کی بدنما آواز

پہرے داروں کی بدنما آواز اور دیوار پر لگے ہوئے کانچ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس شہر کے لئے اب کوئی نئی بات نہیں ہے کیوں کہ:

آج دیوار کھنچ گئی ہے اگر
شہر کل بھی تھا صورت زنداں

جب ہم اس شہر کے دروازے سے داخل ہو کر گلیوں اور محلوں میں آتے ہیں اور لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھتے ہیں تو فراز ہمیں چپکے سے بتاتے ہیں

رہگیروں کی خاموشی کو غور سے سن

یوں ہے جیسے ماتم کرتے جاتے ہیں

راستوں کے دونوں جانب لگے ہوئے درختوں کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے بھی وہ کہتے ہیں۔

درخت ماؤں کی مانند انتظار میں ہیں
طیور لوٹ کے آئے نہ آشیانوں میں

درختوں کی بات نکلی تو اس شہر کے موسموں کا حال بھی فراز ہی سے پوچھتے چلیں:

اب کے ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے دلوں پر تیر چلیں
اب کے گلابوں کا موسم بھی وار کرے تلواروں سا

گلابوں کا موسم بھی جب تلواروں جیسا وار کرنے لگے تو نگاہیں محافظان شہر کی طرف اٹھتی ہیں فراز ان کو مخاطب کرتے ہوئے طنزیہ کہتے ہیں۔

بزم میں یاروں کی شمشیر لہو میں تر ہے
رزم میں لیکن تلواروں کو میان میں رکھنا

وہی سپاہ ستم خیمہ زن ہے چاروں طرف
جو میرے بخت میں تھا اب نصیب شہر بھی ہے

ایسے میں اہل شہر سے فراز کو بڑی شکایتیں ہیں نہ کوئی آواز نہ کوئی جھنکار نہ کوئی اظہار کی جرأت اور نہ کوئی انکار کی صورت۔ وہ ان سب اہل شہر کو اور خاص طور سے اس کے اہل قلم کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں

یہ کس عذاب سے خائف مرا قبیلہ ہے

کہ خون مل کے بھی چہروں کا رنگ پیلا ہے
نہ جانے کیا ہوا زندانیوں کو
کہ بے آواز ہے زنجیر پا تک
کچھ اپنے شہر کا قاتل بھی بے مروت تھا
کچھ اپنے عجز نے بھی حوصلہ دیا ہے اسے
اسی لیے اس شہر میں قاتل اور اسکے مصاحبین بار بار فراز کے طنز کا نشانہ بنتے ہیں۔
عجب نہیں ہے جو خوشبوؤں سے ہے شہر خالی
کہ میں نے دہلیز قاتلاں پر گلاب دیکھے
ظالموں اور قاتلوں کی دہلیز پر گلاب رکھنے والے لوگ کون ہیں؟ یہ بات فراز کے علم میں ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں:
قاتل اس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب
ایک درویش بھی دیکھا اسی دربار کے بیچ

شہر والے سب امیر شہر کی مجلس میں ہیں
کون آئے گا غریب شہر نا پرساں کے پاس
اس شہر میں ریاکاری کی رسم ایسی چلی ہے کہ:
وہ جو قاتل تھے وہ عیسیٰ نفسی بیچتے ہیں
وہ جو مجرم ہیں انہیں اہل عدالت دیکھوں

وہ جو بے ظرف تھے اب صاحب میخانہ ہوئے
اب بمشکل کوئی دستار سلامت دیکھوں
گردنیں ٹوٹی ہوئی سر ہیں خمیدہ جن کے
ان کو سرگشتہء پندار امامت دیکھوں

احمد فراز کی شاعری اپنے شہر کی دکھ بھری تاریخ ہے۔ کیلنڈروں پر چھپے ہوئے دن تاریخ اور مہینوں کے ہندسے بدلتے رہے لیکن شہر فراز کے المیوں میں کمی تو کیا اضافہ ہی ہوتا رہا اور یوں اس کے دکھوں اور غموں سے بننے والے گراف کے زاویوں کا رخ ہمیشہ اوپر کی طرف ہی رہا۔ دکھوں اور غموں میں ہونے والا یہ اضافہ شہر فراز کے گلی کوچوں میں تاریکیوں کے تسلط کو مستحکم کرتا رہا اور پھر یوں ہوا کہ لوگوں کی بصارتیں ضائع ہوگئیں سارا شہر اندھا ہوگیا "نابینا شہر میں آئینہ" اسی غم کی یاد تازہ کرتا ہے۔

کینیڈین اردو انٹرنیشنل ایوارڈ

گزشتہ صدی کی آخری دو دہائیوں میں شمالی امریکہ کے تارکین وطن کی ادبی اور ثقافتی زندگیوں میں کافی جوش ولولہ اور گرمی پائی جاتی تھی۔ اُن دنوں بھی اور آج کل بھی کینیڈا میں ان سرگرمیوں کا مرکزی شہر ٹورنٹو ہی ہے۔ ۸۵-۱۹۸۶ء میں یہاں کے کچھ دوستوں نے یہ سوچا کہ اردو ادب کے کیسے کیسے بڑے اور نامور شاعر و ادیب یہاں آتے ہیں تو کیوں نہ اُن کی آمد کو یادگار بنانے اور ان کی ادبی خدمات کو سراہنے کے لیے کسی ادبی ایوارڈ کا اجرا کیا جائے؟ اُس وقت تک کینیڈا یا امریکہ سے کسی باقاعدہ ایوارڈ کا اجرا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے ابتدا میں بیدار بخت، اشفاق حسین اور کرنل احمد نے کینیڈین اکیڈمی آف اردو لینگویج اینڈ لٹریچر کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی جس میں بعد میں چند اور احباب بھی شامل ہو گئے۔ اس ادارے کے تحت ہر سال ایک ہزار ڈالر کا نقد انعام (اُن دنوں یہ رقم خاصی مناسب تھی)، ہندوستان یا پاکستان سے یہاں تک آنے جانے کا کرایا اور ان

کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب کے اہتمام کا پروگرام بھی شامل تھا۔ ایوارڈ دیتے وقت اس بات کو بھی پیش نظر رکھا جاتا تھا کہ لکھنے والے کی عمر ساٹھ سال سے کم نہ ہو۔یہ سلسلہ باقاعدگی سے نو دس سال تک جاری رہا۔ان اعزاز یافتگان میں علی سردار جعفری' گوپی چند نارنگ' احمد ندیم قاسمی' قرۃ العین حیدر' مشتاق احمد یوسفی' اختر الایمان' جمیل الدین عالی' فرمان فتحپوری اور احمد فراز کے نام شامل ہیں۔

احمد فراز صاحب کو جب یہ ایوارڈ دیا گیا تو اتفاق سے پنجابی اور اردو زبان کی شاعر ثروت محی الدین صاحبہ یہاں موجود تھیں تو انہی کے ہاتھ سے یہ ایوارڈ احمد فراز کو دیا گیا۔اس تقریب کو منفرد بنانے کے لیے یہ سوچا گیا کہ تمام حاضرین کی موجودگی میں ہی احمد فراز سے بات چیت کی جائے۔اس گفتگو میں میرے ساتھ میرے دوست خالد سہیل بھی شامل تھے۔یہ گفتگو ریکارڈ کر لی گئی تھی۔اسی گفتگو کو احمد فراز اور ٹورنٹو کے حوالے سے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

ٹورنٹو میں احمد فراز سے ایک مکالمہ

اشفاق: خواتین و حضرات! احمد فراز صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ان کی ادبی خدمات سے آپ سب واقف ہیں۔ہم نے سوچا کہ آج ہم ان کا Live Interview کریں تا کہ آپ سب ان کے خیالات سن سکیں۔مقصد یہ ہے کہ ہم اور یہاں موجود ہمارے سامعین فراز صاحب کی شخصیت اور خاص طور سے اُن کی شاعری کے بارے میں خود ان ہی کی زبانی مزید جان سکیں۔

سوال: فراز صاحب! ہم نے سوچا کہ انٹرویو کا آغاز بچپن سے کیا جائے۔ ویسے تو ہر شخص کی شخصیت میں بچپن کا ماحول اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن ایک شاعر اور مفکر کے لیے وہ کچھ اور بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے مجھے تجسس تھا کہ آپ نے جس ماحول اور جس گھرانے میں پرورش پائی اس کی کس قسم کی یادیں آپ کے ذہن میں محفوظ ہیں؟

جواب: خواتین وحضرات۔ میرے لیے ٹورنٹو کا شہر بلکہ کینیڈا ایسے ہی ہے جیسے میں اسلام آباد یا لاہور میں ہوں۔ آپ کی محبت اور مہربانی بھی ہمیشہ میسر رہی ہے جو میرے لیے خوشی کی بات ہی نہیں فخر کی بات بھی ہے۔ اس دفعہ ٹورانٹو میرے پروگرام میں شامل نہ تھا لیکن جب اشفاق نے مدعو کیا اور میرا جی بھی چاہتا تھا کہ آپ لوگوں سے ملوں تو میں نے مان لیا۔ سوچا یہاں کے دوستوں سے ایک دفعہ پھر ملاقات ہو جائے گی کیونکہ ایسے موقع روز روز تو آتے نہیں ہیں ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ ویسے تو آپ لوگوں سے اس سے پہلے بھی بہت سے موضوعات پر تبادلۂ خیال ہو چکا ہے۔ شعر بھی سنا چکا ہوں سوالوں کے جواب بھی دے چکا ہوں مگر میں آج ایک وجہ سے Nervous ہوں۔ میری آج وہی کیفیت ہے جو بچپن میں دسویں جماعت کا امتحان دیتے وقت ہوئی تھی میں ڈرائنگ کا سٹوڈنٹ تھا ان دنوں ایک ڈرائنگ بورڈ اور ایک T ہوتی تھی۔ امتحان میں وہ اپنا لے جانا پڑتا تھا۔ میری T راستے میں سائیکل کیریر سے کہیں پیچھے گر گئی۔ امتحان کے ہال میں پہنچا تو میرے پاس بورڈ تو تھا T نہیں تھی۔ ایک ساتھ والے طالبعلم سے کہا کہ اپنی T دے دو۔ Invigilator آیا اور پوچھنے لگا کہ تمہاری T کہاں ہے میں نے کہا کہیں راستے میں گر گئی ہے کہنے لگا تم

کیسے سپاہی ہو کہ میدان جنگ میں آئے ہو اور اپنی تلوار گھر بھول آئے ہو۔ بہر حال آج یہ واقعہ اس لیے یاد آیا کہ جب پاکستان سے چلنے کا وقت آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میری بیاض تولا ہور رہ گئی ہے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ منگوائی جا سکے۔ بہر حال جو کچھ مجھے یاد تھا وہ میں نے نقل کر لیا۔ کل شکاگو میں ایک نشست تھی جہاں میں نے کلام سنایا۔ آج میں کاپی ڈھونڈنے لگا تو پتہ چلا کہ وہ کاپی جس میں میں نے اپنا کلام نقل کیا تھا وہ شکاگو میں رہ گئی ہے۔ اس لئے میں آج تھوڑا سا نروس ہو رہا ہوں۔ میں نے جس گھر میں پرورش پائی اس کا ماحول ادبی تھا۔ میرے والد صاحب فارسی کے شاعر تھے اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ وہ ایک بزم سخن کے جو ایک ادبی ادارہ تھا صدر تھے لیکن مجھے نہ شعر و شاعری کا شوق تھا اور نہ دیوان خانے میں جانے کی اجازت تھی جہاں والد صاحب کے دوست وغیرہ آیا کرتے تھے۔ مجھے شاعری کا اس وقت شوق ہوا جب میرے بڑے بھائی نے مصرعے بنانے شروع کیے میں نے بھی دو چار شعر لکھے لیکن یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ ہمارے بس کا کام نہیں۔ گھر کی فضا سے زیادہ جس شخص نے مجھے شاعری کی طرف راغب کیا وہ ہماری کلاس فیلو تھیں۔ کلاس فیلو اس اعتبار سے کہ ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے ورنہ اسکول الگ الگ تھے اور ان کی والدہ اور ہماری والدہ آپس میں دوست تھیں۔ گھروں میں آنا جانا رہتا تھا۔ ایک دن ان کی والدہ نے کہا کی گرمیوں کی چھٹیوں میں اکٹھے Home Work کر لیا کرو۔ ایک دن اس لڑکی نے ہم سے پوچھا کہ کیا تمہیں بیت بازی آتی ہے۔ میں نے کہا نہیں وہ کیا ہوتی ہے؟ اس نے کہا اس طرح شعر ہوتے ہیں اس طرح شعر پڑھتے ہیں۔ اس

شوق میں ہم نے شعر پڑھنے شروع کیے اور اب نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے۔ وہ تو چلی گئیں جہاں انہوں نے جانا تھا اور آج تک یہ شعر، یہ ڈھول ہمارے گلے میں بندھا ہے اور ہم بجا رہے ہیں۔ کالج پہنچے تو ہم نے Inter Colleges مشاعروں میں حصہ لیا۔ ہمیں یاد ہے پہلا مشاعرہ گجرات میں تھا۔ ہمارا پرنسپل انگریز تھا ہم نے ڈرتے ڈرتے اس سے کہا کہ مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں پہلے تو اسے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں سمجھایا کہ مشاعرہ کیا ہوتا ہے۔ خیر اجازت مل گئی تو گجرات پہنچے معلوم ہوا وہاں سارے ملک کے کالج کے لڑکے آئے ہوئے تھے۔ لاہور کی بہت سی ٹیمز تھیں کوئی احسان دانش کا شاگرد تو کوئی سیف الدین سیف کا شاگرد۔ ہم بڑے کامپلکس کا شکار ہوئے۔ ڈر ڈر کر ہم نے غزل سنائی۔ نظم میں ہمیں کانفیڈنس تھا وہ ہم نے پڑھی۔ ہمیں حیرت ہوئی جب غزل اور نظم دونوں میں ہمیں انعام ملے۔ یہ ہی واقعات تھے جنھوں نے ہمیں اس لائن پر لگا دیا۔ جب میں میں تھرڈ ایر میں تھا تو میری پہلی کتاب "تنہا تنہا" چھپی۔

سوال: فراز صاحب! کہا جاتا ہے کہ شاعری کارِ پیغمبراں ہے لیکن اس میں اکتسابِ ہنر اور ذاتی لگن کا بڑا دخل ہوتا ہے اور ادبی انجمن، شخصیات اور رسائل اہم کردار ادا کرتے ہیں آپ کی زندگی میں کون سے اساتذہ، کتب اور شخصیات تھیں جنھوں نے آپ کی رہنمائی کی؟

جواب: آپ کی بات ٹھیک ہے کہ شاعری کارِ پیغمبراں ہے اور اس میں صلیب اٹھا کر چلنا پڑتا ہے۔ میری تربیت میں کراچی کا وہ سفر اہم تھا جو میں نے سیکنڈ ایر میں کیا

تھا۔ہم ایک دفعہ فارغ اور رضا ہمدانی کے ہاں بیٹھے تھے کہ زیڈ اے بخاری صاحب جو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل تھے تشریف لائے۔وہاں ظاہر ہے شعر سنائے گئے ہم وہاں جونیر موسٹ(Junior most) تھے ہم سے کہا گیا کہ شعر سناؤ۔ہم نے ایک غزل سنائی دوسری سنائی انہوں نے شفقت برتی۔انہوں نے کہا فراز تم جب چاہو ریڈیو کی ملازمت اختیار کر سکتے ہو۔یہ بہت بڑا Incentive تھا بلکہ Temptation تھی۔اس سے مجھ میں Confidence ہوا کہ ملازمت کسی وقت بھی مل سکتی ہے والد صاحب کسی بات پر ناراض ہوئے اور ہم نے ریڈیو والوں کو خط لکھ دیا اور ہمیں وہاں سے Appointment letter آ گیا اور ہم جہاز میں بیٹھ کر وہاں پہنچ گئے۔ہمارے ساتھ ایک مولوی صاحب بیٹھے تھے۔جب جہاز کو جھٹکا لگا اور وہ نیچے گیا تو ان پیر صاحب کی جنہیں بہت سے لوگ چھوڑنے آئے تھے تسبیح کی رفتار جہاز کی رفتار سے تیز تر ہو گئی۔بہر حال میں وہاں پہنچا اور ریڈیو کے ساتھ کام شروع کر دیا۔ان دنوں شاہد احمد دہلوی اور بعد میں چراغ حسن حسرت بھی ریڈیو سے وابستہ تھے۔میں Script Writer کی حیثیت سے شامل ہوا مجھے بہت محنت کرنی پڑتی تھی میں احساسِ کمتری میں بھی مبتلا تھا وہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔مجھے وہاں ماں بہت یاد آتی تھی چنانچہ میں پانچ مہینوں کے بعد واپس آ گیا اور پیشاور کے ریڈیو اسٹیشن ٹرانسفر کر دیا گیا۔میں سکرپٹ رائٹر کے طور پر کام بھی کرتا تھا اور کالج بھی جاتا تھا پہلے میں نے بی اے کیا پھر ایم اے۔ پھر فارسی میں ایم اے کیا۔

سوال: آپ کی اپنی زندگی میں بہت سی ادبی اور Professional

رہیں۔ آپ نے معلّمی بھی کی۔ پاکستان آرٹس کونسل اور Involvements
PAKISTAN Academy of Letters کے ساتھ بھی رہے اس سفر
میں کونسی Involvement آپ کے دل کے سب سے زیادہ قریب رہی؟

جواب: ریڈیو سے میری ملازمت کا آغاز ہوا لیکن میری خواہش تھی کی میں
پڑھاؤں اس سے ایک تو پڑھنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے یہ کہ آپ پڑھاتے رہیں تو علم
کو تازہ رکھنے کے لیے آپ چار کتابیں دیکھتے ہیں۔ ہمارے جیسے ایک پروفیسر کہا
کرتے تھے کہ پہلے سال محنت کرو باقی معلّمی میں حرام خوری ہی حرام خوری ہے لیکن ہم
نے وہ بات نہیں مانی۔ جب میں نے ایم اے کرلیا تو یونیورسٹی نے خود ہی مجھے جاب
(Job) آفر (Offer) کیا۔ اس معاملے میں میں بہت خوش قسمت رہا ہوں
کی ہمیشہ مجھے Jobs Offer آئی۔ Apply کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔
ریڈیو کی ملازمت تھی تب مجھے Offer آئی ایم۔اے کرلیا تو یونیورسٹی سے
OFFER آئی۔ نیشنل سنٹر کے ڈائرکٹر ہوئے تو اس کے لیے کوئی خاص انٹرویو نہیں
ہوا۔ Academy of Letters بنی تو مجھے Recommend کیا گیا۔
باہر آئے تو وہ بھی انہوں نے RECOMMEND کیا۔ اپنی خوشی سے کوئی کام
نہیں کیا ویسے معلّمی مجھے ہمیشہ پسند رہی لیکن ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے مجھے
Teaching سے بددل کردیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اسے چھوڑ دوں گا۔ ہمارے
ایک سینیر پروفیسر ہوا کرتے تھے جو بعد میں کالج کے پرنسپل بن گئے تھے۔ وہ بہت
نفیس اور Dedicated آدمی تھے ان کی ریٹائرمنٹ کو چھ مہینے رہتے تھے کہ ایسی

Politics ہوئی کہ لڑکوں کے ایک گروہ نے انہیں گالیاں دیں۔ میں نے سوچا اس profesion میں عزت ہی تو تھی نہ اچھی تنخواہ ہوتی تھی نہ Fringe. Benefits ہوتے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر ایسے پروفیسر کا یہ انجام ہو سکتا ہے تو انشاجی اٹھواب کوچ کرو۔ چنانچہ جب موقع ملا تو میں کالج چھوڑ کر آرٹس کونسل کا ڈائرکٹر بن گیا۔ ہر Job میں ادب سے کسی نہ کسی حوالے سے رشتہ رہا۔

سوال: فراز صاحب! ابھی آپ نے کہا ہے کہ جس ماحول میں آپ نے پرورش پائی اس میں پہلے آپ کے والد صاحب تھے جو فارسی کے ایک اچھے استاد اور شاعر تھے پھر آپ نے بخاری صاحب کا ذکر کیا وہ بھی فارسی اور مشرقی علوم کے ماہر تھے وہ کیا حالات تھے کہ آپ نے فارسی کے بجائے اردو ادب کی طرف توجہ دی اور فارسی میں آپ کا Contribution سامنے نہیں آیا جب کہ آپ خود فارسی کے عالم آدمی ہیں؟

جواب: فارسی کا عالم تو نہیں کہہ سکتا۔ والد صاحب کی لائبریری میں جو ذخیرہ تھا اس میں سے دو چار کتابوں سے فیضیاب ہوا، میں نے فارسی میں کچھ شعر وغیرہ بھی کہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ جس بات سے بیت بازی شروع ہوئی تھی وہ اردو تھی۔ چاہے اسے عشق کہیں چاہے اسے Romanticism کہیں وہ میری پہلی محبت تھی وہ میری پہلی شکست تھی۔ پھر تو پیمانِ وفا سو مرتبہ میں نے کہا۔ باقی باتیں تو خوشخطی کے لیے تھیں۔ کتابیں لکھنا علیحدہ بات ہے لیکن جو عشق تھا وہ اردو سے تھا اور وہ عمر بھر جاری رہا۔

سوال: اب کچھ باتیں شاعری کے حوالے سے ہو جائیں، میں جب آپ کے کلام

کا مطالعہ کرتا ہوں تو جہاں ایک طرف مجھے رومانوی اور سیاسی شاعری نظر آتی ہے وہیں مجھے سلام اور نعت بھی نظر آتے ہیں آپ کو نعت اور سلام کہنے کی تحریک کیسے ہوئی؟

جواب: بات یہ ہے کہ موضوع کوئی بھی ہو شاعری کا معیار برقرار رہنا چاہئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ہر موضوع سے انصاف کیا ہے جہاں تک نعت اور سلام کا تعلق ہے وہ مختلف ضرور ہیں لیکن ان سب میں جذبہ ایک ہی ہے اور وہ جذبہ انسان دوستی کا ہے۔ اگر آپ میری پہلی کتاب کی پہلی نظم "شاعر" پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ صرف نظم ہی نہیں میرا Manifesto بھی تھا انسان دوستی کا اور سماجی ناہمواریوں کے خلاف جدوجہد۔ میں غیر مذہبی یا Less Religious یا Non Religious ہوتے ہوئے بھی عظیم شخصیتوں کو مانتا ہوں۔ رسول کو اور حسین کو بڑا انسان اور راہبر سمجھتا ہوں۔ میں نے رسول کے لیے نعت لکھی تو کیا ہوا لوگ تو وزیراعظم اور صدروں کے لیے نعتیں لکھتے ہیں میں نے جو بھی لکھا دل سے لکھا جب تک کوئی چیز محسوس نہیں کی تب تک نہیں لکھی۔

مرے رسول کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے
مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

میں نے ان کی شخصیت کے پیغام کو اپنے عہد کے حالات میں شامل کر کے وہ چیز تخلیق

کی جہاں ان کی عظمت کا اعتراف بھی ہے وہیں اپنے عہد کے مظالم کا ذکر بھی۔

سوال: آپ نے ابھی جو مذہب کے حوالے سے سوال کا جواب دیا ہے اس میں یوں لگتا تھا جیسے آپ مذہب کے Progressive نقطۂ نظر کی ترجمانی کر رہے ہوں۔ مجھے جوش ملیح آبادی کا شعر یاد آ گیا

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

۱۹۳۵ء کے زمانے میں ترقی پسند تحریک پر غیر مذہبی ہونے کا الزام لگایا جاتا رہا۔ آپ ترقی پسند تحریک اور اس کے اکابرین سے کس حد تک متاثر ہوئے؟

جواب: بات یہ ہے کہ محبت اپنا اپنا تجربہ ہے اس میں فرہاد و مجنوں معتبر نہیں۔ ہمارے ہاں ترقی پسند تحریک اپنا لبادہ لے کر آئی۔ فیض صاحب کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ انہوں نے اقبال کو بڑا شاعر سمجھا انہوں نے کہا کہ انیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر غالب تھا اور بیسویں صدی کا سب سے بڑا شاعر اقبال ہے۔ اقبال کی ساری Philosophy اور Diction مذہبی تھی ترقی پسند تحریک نے اقبال کے خلاف جو مضامین پڑھے تو فیض صاحب نے ان کا جواب دیا۔ ہم نے بھی پارٹی لائن سے Detatch ہو کر کچھ فیصلے کیے۔ منٹو کو انہوں نے ترقی پسند نہیں سمجھا لیکن ہم نے اسے قبول کیا وہ جرأت مند آدمی تھا اسکا اپنا Contribution تھا۔ پارٹی کا مذہب کو رد کر دینا بڑی غلطی تھی۔ مذہب نے اپنے زمانے میں بڑا رول ادا کیا ہے۔ مذہبی تحریکیں بنیادی طور پر Reformist تحریکیں تھیں۔ جب پیغمبری

بند ہو گئی تو لوگوں نے اور نام رکھے۔ نئے لوگ آئے انہوں نے کتابیں لکھیں یعنی۔

اس عہد میں ہیں اہل کتاب اور طرح کے

انہوں نے قوموں کو Lead کیا ترقی کی منزل تک پہنچایا ہم Fundamentalism فاشزم اور Militant رویوں کے پہلے بھی خلاف تھے اور آج بھی ہیں۔

سوال : فراز صاحب! آپ کی بین الاقوامی ادب پر بھی نظر ہے۔ پچھلے دنوں میں آپ کی جنوبی افریقہ کے شاعروں کی نظموں کا ترجمہ پڑھ رہا تھا۔ آپ کے خیال میں عالمی ادب میں اردو ادب کا کیا مقام ہے؟

جواب : پہلی بات تو یہ کہ کوئی کتنا بھی پڑھ لے کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا عالمی ادب تو کیا اپنے ادب کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہے۔ اپنی زبان کی بات اور ہوتی ہے جس میں آپ لکھتے ہیں سوچتے ہیں دوسری زبان کے بعض Images بہت اچھے لگتے ہیں۔ اردو کے کئی شاعر اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شاعری کرنے لگے۔ راشد کی شاعری دیکھیں فارسی سے بھری پڑی ہے شاید اسی لیے وہ اتنے Popular بھی نہیں ہوئے۔ اردو زبان کی اتنی عمر نہیں ہے لیکن اسکی خوش قسمتی ہے کہ اسے شروع سے ہی میر، سودا اور غالب جیسے شاعر مل گئے۔ اردو کے بہت سے ادیب نثر فارسی میں لکھتے تھے حتیٰ کہ اپنے دیوان کا پیش لفظ تک فارسی میں لکھتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اردو نثر میں ابھی اتنی جان نہیں ہے۔ اردو تنقید کا معیار تو ابھی تک اونچا نہیں ہو سکا۔ یہی دیکھیے، انگریزی ادب کے تنقیدی ڈھانچے کا چربہ نظر آتا ہے۔ فیض اور فراق نے کچھ اچھے مضامین لکھے

ہیں لیکن مجموعی طور پر معیار بلند نہیں ہے۔ فکشن کا گراف البتہ بہت اوپر گیا ہے۔

سوال: آپ نے شاعری کی قبولیتِ عام کی بات اٹھائی ہے۔ راشد کے حوالے سے یا ان شاعروں کے حوالے سے جن کا Persianized Diction ہے دوسری طرف تنقید کی بات کی اسکا معیار بلند نہیں ہوا۔ ہمارے ہاں نقادوں کا ایک سکول ہے جس نے آپ کو Proper attention نہیں دی آپ پر اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ احمد فراز صرف ایک مقبول شاعر ہیں آپ کا اپنا بھی ایک مصرعہ ہے۔ مجاوران ادب سے سند نہیں مانگی۔ تو آپ کا مقبول شاعری اور اسکے بارے میں نقادوں کی رائے کے بارے میں کیا خیال ہے؟

فراز: میں نے جو پہلی بات کی تھی تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں نے No Ball پھینکا ہے اور احساس تھا کہ چھکا و کا لگے گا۔ آپ کے سوال میں دو سوال ہیں ایک یہ کہ کیا مقبول شاعری بڑی شاعری ہوتی ہے یا نہیں۔ میں نے نہ تو کبھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ میری شاعری مقبولیتِ عام حاصل کر چکی ہے نہ مجھے اسکا دعویٰ ہے کہ کل میرا لکھا ہوا حرف رہتا ہے یا نہیں رہتا۔ میرے لیے یہ بڑے سکون کی بات ہے کہ جب سے میں لکھ رہا ہوں لوگوں نے مجھے بہت محبت دی ہے میں ان کے لیے لکھتا ہوں اپنے لیے لکھتا ہوں نقادوں کے چھوٹے سے گروپ کے لیے تو لکھتا نہیں۔ آجکل یہ عالم ہے کہ جو لوگ شاعر نہ بن سکے وہ نقاد بن گئے۔ میرا تو خیال ہے کہ جو شخص شاعری میں اپنا معیار قائم نہیں رکھ سکا وہ کسی اور شاعر کا معیار پرکھنے کا حق نہیں رکھتا اسکی ایک مثال ہمارے ہاں وزیر آغا صاحب ہیں اب ان کی اپنی شاعری کی سطح اتنی چھوٹی ہے کہ ان کو

حق بھی نہیں پہنچتا کہ وہ شعر کے بارے میں مستند رائے یا سند نوازی سے کام لیں۔
ہمارے ایک بڑے ذہین شاعر مصطفیٰ زیدی ہوا کرتے تھے انہوں نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا کہ مجھے نقادوں نے نظر انداز کیا ہے حتیٰ کہ وزیر آغا نے بھی میرا ذکر نہیں کیا اور میں شاعری چھوڑتا ہوں۔ افسوس اسی بات کا ہے کہ اپنے سے چھوٹے آدمی کی بات پر انہوں نے بڑی شاعری چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ مصطفیٰ زیدی چھوٹے دل کا آدمی تھا زود رنج تھا۔ چھوٹے سے فیصلے میں ہار اتو شاعری چھوڑ دی۔

سوال: فراز صاحب! آپ سے ادب اور معاشرتی پابندیوں کے حوالے سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی بہت سی چیزوں پر پابندیاں لگیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادیب کی آزادی اظہار کی حد کہاں ختم ہوتی ہے اور معاشرے کو اپنے اقدار کے تحفظ کے لیے پابندیاں لگانے کی حد کہاں شروع ہوتی ہے؟

جواب: معاشرہ کیا ہے لوگوں کے مجموعے کا نام ہی تو ہے۔ ویسے تو غالبؔ سوداؔ اور میرؔ پر بھی پابندیاں لگائی گئیں لیکن ہمارے ہاں Pakistan کے بعد ایک خاص قسم کا Political System قائم رہا اور آمریت، مارشل لاء اور فوجی حکومت کا سلسلہ چلتا رہا جس نے ادیبوں پر پابندیاں لگائیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر ان کا آنا بند کیا گیا ان کی روزی کا سلسلہ بند کیا گیا۔ جب زبان پر پہرے لگتے ہیں تو ان کا ردِ عمل ظاہر ہوتا ہے وہ پانی کی طرح ہے ایک طرف سے روکیں گے تو دوسری طرف سے ابھرے گا اسکا بہاؤ رک نہیں سکتا روکنے سے اسکی رفتار اور تیز ہو جائے گی۔ اسی لیے ہم جیسے لکھنے والوں کے انداز میں Loudness آئی۔ جب آپ کی آواز کوئی نہیں سنتا یا گلا

دباتا ہے تو آپ شدت سے چیخنا چاہتے ہیں اسی طرح کی تحریریں آپ کو ہر دور میں نظر آئیں گی۔ سنسر شپ میں جب الفاظ دبائے جاتے ہیں تو بازو اٹھ جاتے ہیں جو ایک خطرناک بات ہوتی ہے لیکن یہ بات لیڈروں یا ڈکٹیٹروں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم تو دھیمے لہجے کے محبت کرنے والے شعر کہا کرتے تھے۔ اب کے بچھڑے ہیں تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں لکھا کرتے تھے ہمیں کیا ضرورت تھی کہ "محاصرہ" اور "پیشہ ور قاتلو" جیسی نظمیں لکھتے۔ ہم تو دھیمے لہجے میں انسان دوستی کی بات کرتے تھے لیکن جب حالات بدلے تو جو محسوس کیا وہ لکھا معاشرے کا دباؤ جتنا بڑھتا ہے اتنی ہی آواز میں تبدیلی بھی آتی ہے اور چیخ بھی نکلتی ہے۔

سوال: آپ نے ابھی آزادی اظہار کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے "محاصرہ" اور "پیشہ ور قاتلو" جیسی نظموں کا ذکر کیا۔ "محاصرہ" نظم تو آپ کی کتاب میں شامل ہے لیکن "پیشہ ور قاتلو" جو جو آپ نے ۱۹۷۷ء میں لکھی تھی کسی کتاب میں شامل نہیں۔ اس نظم کی بنیاد پر آپ کو قید تنہائی گزارنی پڑی اسکی کیا وجہ ہے کہ یہ نظم آپ کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے؟

جواب: اسکی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ اس نظم میں زیادہ جذباتیت تھی۔ اس دور میں آرمی نے جو رول اختیار کیا تھا اس نظم میں میں نے اسکے بارے میں ردعمل تحریر کیا تھا۔ اس نظم کی سینکڑوں کاپیاں خود بخود بٹتی گئیں قریشی صاحب نے جو میری نظموں کے ترجمے کی کتاب چھاپی ہے اس میں یہ نظم شامل ہے۔

سوال: اس نظم اور قید تنہائی کا کیا تعلق ہے؟

جواب: ۱۹۷۷ء میں جب فوج نے عوام پر گولی چلائی تو میرا دل ٹوٹا فوج کا کام اپنے لوگوں پر گولی چلانا نہیں ہے میں نے کہا ہم فوجیوں کو اتنی مراعات اور سہولتیں فراہم کرتے ہیں تا کہ جب ملک اور قوم پر آزمائش کا وقت آئے تو وہ ہماری حفاظت کریں اور اپنی جان قربان کردیں یہ نہیں کہ اپنے ہی لوگوں پر گولی چلائیں۔ اس نظم کا خیال ایک غزل کے شعر میں بھی آیا ہے۔

عدو کے سامنے ہتھیار ڈالنے والا

کوئی فراز سا کافر نہیں تھا غازی تھا

سوال: آپ کی ملکی سیاسی صورت حال پر گہری نظر رہی ہے بنگلہ دیش بنا تو آپ نے لکھا

پھر یوں ہوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا

اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

پاکستان کے سیاسی حالات آپ کے سامنے ہیں اور باقی دنیا کے بھی چاہے وہ روس کے ہوں یا جنوبی افریقہ کے۔ پاکستان کے صوبوں میں جو سیاسی بے چینی پائی جاتی ہے ان کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: میں کہا کرتا ہوں کہ ملک کی قدر دو طرح کے لوگوں سے پوچھیے۔ ایک اسرائیلیوں سے جن کو ساری عمر دھتکارا گیا وہ بھٹکتے رہے اور اب انہیں جسطرح سے بھی ملک ملا انہیں احساس ہے کہ اس ملک کو کس طرح سنبھالا جائے اور دوسرے فلسطینیوں سے پوچھیے ان سے ملک چھینا گیا تو اب وہ کسطرح دربدر پھر رہے ہیں

ہمیں یہ پیارا خوبصورت ملک مل تو گیا لیکن ہماری لیڈر شپ ہمیشہ خان بہادری کی رہی قائداعظم کے علاوہ جتنے بھی لوگ تھے کوئی نواب تھا، کوئی جاگیردار تھا تو کوئی زمیندار۔ جب پاکستان بنا تو جاگیرداروں اور نوابوں نے اپنی سلطنت یہاں قائم کرلیں چنانچہ ترقی پسند باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں ولی خاں کہتا ہے کہ میرے صوبے کا نام پختونستان رکھ دو یا خیبر رکھ دو تو کہتے ہیں یہ بغاوت کی بات ہے۔ جس علاقے میں سندھی رہتے ہیں اسکا نام سندھ ہے جہاں پنجابی رہتے ہیں اسکا نام پنجاب ہے، جہاں بلوچی رہتے ہیں اسکا نام بلوچستان ہے تو پختونستان نام رکھ لینے سے کیا فرق پڑ جاتا ہے۔ اسکی کوئی Identity ہونی چاہیے اسکو اتنا بڑا Issue بنالیا۔ پھر لسانی جھگڑے کھڑے کردیے۔ مجھے کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپ پشتو میں نہ لکھیں اردو میں لکھیں It was my own choice زبان سے محبت تھی سو میں نے اردو میں لکھا۔ ابھی جب سندھ میں پٹھان اور مہاجر کا جھگڑا ہو رہا تھا تو میں نے سندھ پر ایک نظم لکھی سیاسی جلسہ تھا سیاسی لیڈر موجود تھے نہ جانے مجھے کیوں کہا گیا کہ آپ صدارت کریں میں نے وہاں ایک نظم پڑھی جس میں کہا گیا تھا کہ اے مرے اردو بولنے والو نمازیو مجھے قتل کردو کیونکہ میں پٹھان ہوں یا پٹھانو مجھے قتل کردو کہ میں اردو میں لکھتا ہوں میرے لیے تو دونوں صورتوں میں قتل واجب ہے تم کرو یا وہ کریں۔ چھوٹے صوبوں کے جو حقوق تھے ان کو ان سے محروم رکھا گیا۔ تحریکیں جب سطح کے نیچے چلی جاتی ہیں تو نتائج خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم چیزوں کو سطح پر قبول ہی نہیں کرتے آج بھی ملک میں کوئی حادثہ ہو جائے تو لوگ

اپنے ریڈیو کی بجائے BBC سے خبریں سنتے ہیں اور جب سب لوگوں کو پتہ چل جاتا ہے تو ہمارا ریڈیو نشر کرتا ہے۔ اگر آج آپ اپنے لوگوں کو Confidence میں نہیں لیں گے تو کل وہ آپ کا ساتھ کیسے دیں گے۔ اگر آپ مشکل لمحوں میں بھی عوام کو اعتماد میں لیں گے تو پھر خاندان کا سا ماحول پیدا ہوگا جس میں غم بھی Share ہوں گے خوشیاں بھی۔ مفلسی بھی Share کریں گے دولت بھی۔ اگر میں اکیلا ہوں اور مجھے میرے تین بھائی مارتے رہیں گے تو میں مجبور ہو کر غیروں کو مدد کے لیے پکاروں گا۔ اگر میرا غیروں کو بلانا غیر اخلاقی لگتا ہے تو اب تک مجھ پر جو ظلم بھی ہوتے رہیں انہیں بھی بداخلاقی سمجھنا چاہیے۔

سوال: آپ نے پاکستان کے سیاسی حالات کے بارے میں نظمیں لکھیں سندھ کے بارے میں نظم لکھی بنگلہ دیش کے بارے میں نظم لکھی بے آواز گلی کوچوں میں شائع ہوئی تو انتساب ''محصور آوازوں کے نام'' کیا تھا ان محصور آوازوں میں ایک آواز عورتوں کی بھی ہے۔ اسکے بارے میں آپکا کیا خیال ہے اور کیا آپ کی شاعری میں اسکا اظہار ہوا ہے؟

جواب: ہندوستان میں ایک کنیز کو جونا گڑھ میں ایک نواب نے اذیتیں دے کر مارا تھا ان دنوں ایک نظم لکھی تھی جس میں ساری عورتوں کے کرب اور محرومی کا ذکر آیا تھا۔ وہ میری پہلی چند نظموں میں سے ایک تھی جنھوں نے مجھے اپنے پڑھنے والوں سے روشناس کرایا تھا۔ جب مقدمہ چل رہا تھا تو میں نے چند لائین لکھیں لیکن نظم نہ لکھ سکا لیکن جب مقدمے کا فیصلہ ہوا تو دوبارہ تحریک ہوئی اور میں نے عدالتوں اور

معاشرے کے Attitude پر قلم اٹھایا۔عورت عورت پر ظلم کرتی ہے مختلف class کی وجہ سے سماجی رتبہ کی وجہ سے۔

سوال: فراز صاحب! آپ کی جتنی Contributions ہیں وہ سب شاعری کے حوالے سے ہی عوام کے سامنے آئیں۔کیا آپ نے کبھی نثر بھی لکھی؟

جواب: اصل میں میں بے صبرا آدمی ہوں۔ٹک کر بیٹھا نہیں جاتا۔اپنی مرضی سے نہیں بیٹھ سکتا۔بہت سے رسالوں اور پبلشرز نے Autobiography لکھنے کو کہا ان کے نقطۂ نظر سے وہ Hot seller ہوگا لیکن دو وجوہات کی بنا پر انکار کرتا رہا۔ایک تو یہ کہ مجھ سے بیٹھ کر کام نہیں ہوتا۔دوسری بات یہ کہ بہت سی باتیں ایسی ہونگی کہ یہاں دھماکے ہوں گے ابھی اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ The whole truth لکھ سکیں اور آدھا سچ کہنے سے بات نہیں بنتی۔مرنے سے مجھے کوئی ڈر نہیں لیکن کسی ملایا ڈکٹیٹر کے ہاتھ سے مرنا گوارا نہیں دوست یار قتل کر دیں تو اور بات ہے۔

سوال: آپ کی زندگی کا ایک دور Political exile میں گزرا اس دور میں آپ نے وطن اور شخصیت کے حوالے سے کیا محسوس کیا؟

جواب: بھئی سیدھی بات یہ ہے کہ تکلیف دہ چیز ہے۔مجھے احساس نہیں تھا کہ اتنا دردناک تجربہ ہوگا۔مہینہ دو مہینہ برس دو برس تو انسان سہ لیتا ہے لیکن ایک عمر اس طرح گزارنا کہ کبھی اس سے بات کرتا کبھی اس سے بات کرتا ، کبھی اس شہر میں کبھی اس شہر میں۔جب ایک شہر کا ویزا ختم ہوگیا تو کہیں اور چل دیے۔ Political Asylum اس وقت تک میں نے لی نہیں تھی اور نہ ہی لینا چاہتا تھا۔جلاوطنی کے یہ

روز و شب بہت تھکا دینے والے تھے- یہ گھڑی بہت اذیت ناک تھی زیادہ لوگوں سے اس کے بارے میں کچھ کہتا بھی نہیں تھا اس لیے کہ- پشاور کے مرزا محمود ایک طنزیہ شاعر تھے ان کا شعر ہے کہ:

مخلص سمجھ کے جس سے کہا حالِ مفلسی

اس نے سمجھ لیا کہ اسے قرض چاہیے

ایسے مواقع بھی آئے کہ کسی دوسرے کو احساس نہ ہو کہ دربدری کے عالم میں دوسرے پر بوجھ نہ بن جائیں۔ یہ شکر ہے کہ ہر جگہ دوست اتنے اچھے ملے کہ وطن کی بے مہری بھول گئی وہ اتنے مہربان تھے کہ ساری تکلیفیں بھول گئیں۔

سوال: پاکستان واپس جانے کے بعد کوئی خاص واقعہ؟

جواب: جب پاکستان واپس گیا تو ابھی چوتھا پانچواں دن تھا کہ میرے گھر کے دروازے پر گھنٹی بجی۔ ڈرتے ڈرتے نکلا- کہنے لگے اسلام علیکم- میں نے ہاتھ ملایا کہنے لگے کلمہ پڑھیں- میں بہت عرصے بعد وطن گیا تھا میں نے کہا" کیوں بھئی کیا کلمہ بدل گیا ہے"

اشفاق: فراز صاحب! بہت بہت شکریہ کہ آپ نے گفتگو کے لیے وقت نکالا اور اس طرح ہم سب کو آپ کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں اور پس منظر سے واقفیت حاصل ہوئی۔

فراز: آپ سب کا بھی بہت بہت شکریہ-

احمد فراز کی سترویں سالگرہ

احمد فراز کی سترویں سالگرہ کے موقع پر ٹورنٹو اور واشنگٹن میں جشن فراز کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس سلسلے کی پہلی تقریب ۱۵ ستمبر ۲۰۰۱ء کو واشنگٹن میں ہونے والی تھی لیکن نہ ہو سکی۔ کیوں کہ فراز اسلام آباد سے نیو یارک کے لیے ۱۱ ستمبر کو روانہ ہوئے مگر انہیں کراچی ہی میں اتر جانا پڑا۔ اس لیے کہ نیو یارک ہی کیا امریکہ کے تمام ہوائی اڈے کسی بھی پرواز کے لیے بند ہو چکے تھے یعنی نائن الیون کا بگل بج چکا تھا۔

لیکن جشن فراز کی مناسبت سے اس وقت تک ایک کتاب ''پذیرائی'' کے نام سے ترتیب دے کے میں نے ٹورنٹو ہی سے شائع کردی تھی۔ اس کتاب کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں مضامین' شاعری' تصاویر غرض یہ کہ سارے کا سارا مواد شمالی امریکہ کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پر مشتمل تھا۔ اس کتاب میں میرے بھی تین مضامین شامل تھے۔ پہلا مضمون ''شہر فراز اور اس کے کرداروں کا المیہ'' تھا جو میں نے ۱۹۸۳ء میں نابینا شہر میں آئینہ کی تقریب رونمائی کے موقعہ پر لکھا تھا۔

اس کے علاوہ دو مضامین اسی کتاب کے لیے نئے لکھے تھے۔۔جس میں سے ایک مضمون "پذیرائی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں احمد فراز کی شاعری اور ان کی زندگی کے مختلف ادوار پر تبصرہ تھا۔ اس میں کیا شک ہے کہ احمد فراز کی شخصیت ایک متضاد شخصیت تھی اسی لیے ان کے بارے میں مختلف قسم کی باتیں مشہور تھیں۔۔جن کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے۔۔سو میں نے اپنے اس دوسرے مضمون میں جس کا عنوان "نقطہء نظر" تھا' اس بات کی کوشش کی کہ خود احمد فراز کے دیے ہوئے مختلف انٹرویوز کی روشنی میں چند بنیادی سوالوں کے جوابات تلاش کیے جائیں۔ مثلاً یہ کہ ان کا مذہب کا تصور کیا تھا؟' ان کی حب الوطنی کی کیا توجیہات تھیں؟ اور یہ کہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے تو ان کے یہاں اس کا کیا مفہوم تھا؟ چنانچہ اپنے لکھے ہوئے یہ دونوں مضامین بھی اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔

پذیرائی

برصغیر پاک و ہند کی لنگوا فرینکا اردو زبان اپنی شاعری اور خصوصیت کے ساتھ اردو غزل کے حوالے سے دلوں میں گھر کرنے کا ہنر خوب جانتی ہے۔ اس کی زلفوں کو سنوارنے اور اسکا رنگ و روپ نکھارنے میں اس خطے کے ہزاروں، لاکھوں اہلِ کمال نے اپنا خون پسینہ صرف کیا ہے۔ بظاہر بہت آسان لیکن دراصل بہت مشکل صنفِ سخن ہونے کے ناطے اس کی پکڑ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ حالی نے سچ ہی کہا تھا کہ جب شاعر کے تن بدن سے ڈھیروں لہو کے قطرے صرف ہو جاتے ہیں تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت لیکن جب یہ صورت نظر آجاتی ہے تو پھر ایسے ایسے معجزہ ءفن ظہور میں آتے ہیں جنہیں تاریخ اردو ادب ولی' میر' غالب' حسرت' اقبال' فراق اور فیض جیسے معتبر ناموں سے یاد کرتی ہے۔ ہمارے عہد میں اسی لیلائے غزل کی زلفوں کو سنوارنے کا کام جس شخصیت کے حصے میں آیا ہے اسے ہم احمد فراز کے نام سے جانتے ہیں۔

چند صدی پہلے ولّی کی آغوش میں پروان چڑھنے والی اسی صنفِ سخن

غزل نے آج سے تقریباً ستر سال قبل، پاکستان کے شمالی علاقے کوہاٹ میں ایک ایسے گھر میں اپنا مسکن بنایا جسکے در و دیوار پر فارسی، پشتو، اور اردو کے نقش و نگار جگمگا رہے تھے۔ احمد فرازؔ کے والد جناب برقؔ کوہاٹی اردو اور فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ انہی کے زیرِ سایا شررؔ برقی نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ روایتوں کے سہارے آگے بڑھنے کی یہ پہلی منزل تھی۔ لیکن شررؔ برقی کی سیماب صفت شخصیت نے جلد ہی اس تخلص سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور وہ شررؔ برقی سے، گوہرؔ سرحدی ہوتے ہوئے احمد فرازؔ بن گئے۔ یہ سچ ہے کہ احمد فرازؔ کو شاعری اپنے والد سے ورثے میں ملی ہے لیکن آج جو ان کی قد و قامت ہے، جو معیار و اعتبار انہیں حاصل ہے، اور جو ان کی شہرت و مقبولیت ہے وہ صرف اور صرف ان کی فطری صلاحیتوں، حقیقت کے بے باکانا اظہار اور ریاضت کی مرہونِ منت ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو برِ صغیر پاک و ہند کی ادبی فضاؤں سے ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے ہم اور آپ ان کی سترویں سالگرہ کا جشن نہ منا رہے ہوتے۔ احمد فرازؔ ستر سال کے ہوگئے ہیں۔ مہ جمالوں پر یہ خبر شائد بجلی بن کر گری ہو لیکن ان کے فن کے پرستاروں کے لئے، ان کی شاعری کا حسن آج بھی جوان اور تر و تازہ ہے۔ آج ہم سب درد کے رشتوں میں بندھے ہوئے ان کی جوان اور باغ و بہار شاعری کو خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتے ہیں اور وہ بھی ان کی موجودگی میں:

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

احمد فراز اس مقام پر پلک جھپکتے نہیں پہنچے بلکہ آہستہ آہستہ، قدم بہ قدم وہ ادب کی شاہراہ پر گامزن رہے ہیں۔ انکی شاعری کے پودے نے سب سے پہلے پشاور کی سرزمین پر لہلہانا شروع کیا۔ دیکھنے والی آنکھوں اور محسوس کرنے والے دلوں نے انکی آواز میں ایک نئے رنگ کی جھلکیاں دیکھیں۔ اس نئے رنگ میں ایک اور نئے رنگ کا اضافہ اس وقت اور واضح شکل میں ہوا جب ترقی پسند اہلِ قلم کے قبیلے سے فراز کی روشنائی ہوئی۔ یہ وہی دور ہے جب وہ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کی پشاور شاخ کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ اور اب روایتوں میں جکڑے ہوئے انکے ذہن نے ایک نئی دنیا کے خواب آنکھوں میں بسانے شروع کردیے اور اپنی نظم شاعر میں انہوں نے اس منشور کا اعلان بھی کیا۔

احمد فراز ایک چمکتا ہوا ستارہ بن کر پشاور کے آسمانِ ادب پر جگمگا رہے تھے کہ ریڈیو پاکستان کے اُس وقت کے ڈائرکٹر جنرل ذوالفقار علی بخاری کی نظرِ انتخاب اُن پر جا پڑی۔ اور پھر فراز ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ ہو گئے۔ اُس وقت کا کراچی بقول رئیس امروہوی ''ہند کے پانچ سو شہروں کا بدل ہے یہ شہر'' یقیناً اس شہر اور اس کے ادبی اور علمی ماحول نے فراز کے ذہنی افق کو وسیع کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہوگا۔ اُن دنوں ملک میں ٹیلی ویژن نہیں تھا اور ریڈیو ہی ایک واحد ذریعہ تھا جو انتہائی موثر پلیٹ فارم کے طور پر اہلِ علم و دانش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں بخاری صاحب کے علاوہ چراغ حسن حسرت، حفیظ ہوشیارپوری، عزیز حامد مدنی، شاہد احمد دہلوی، شوکت تھانوی، حمید نسیم، رضی اختر شوق، غرض یہ کہ بہت سے نامور اہلِ قلم کا

اجتماع رہا کرتا تھا۔ ریڈیو کے اسی ماحول نے انکی ذہنی نشوونما میں مثبت کردارادا کیا۔

احمد فراز بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن ترقی پسند فکر کے زیرِ اثر انہوں نے سماجی موضوعات کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ معاشرے میں ہونے والی ظلم وزیادتی اور ناانصافی کے خلاف انہوں نے فکری سطح پر اپنا جہاد جاری رکھا۔ اور غزل کے ساتھ ساتھ نظم کے پیرائے میں بھی اظہارِ خیال کی آگ نہ بجھنے دی۔ معاشرے میں بسنے والے ہر مظلوم طبقے کے حق میں فراز نے آواز بلند کی ہے۔ عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر بھی انکا قلم خون کے آنسو رویا ہے۔ اگر اپنی نظم ''کنیز'' میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر طنز کیا ہے تو ''بانو کے نام'' نظم لکھ کر انہوں نے اپنی شاعری کے احتجاجی لہجے کی لَے کو اور بھی تیز کیا ہے اور ایک شاعر کی سماجی ذمہ داری کا ثبوت بھی دیا ہے۔ جیگم جوناگڑھ نے جب اپنی ایک معصوم کنیز کو ذراسی بات پر قتل کروادیا تو انہوں نے بانو کو ایک استعارہ بنا کر دنیا بھر کی مظلوم عورتوں کی ہمنوائی کا فریضہ انجام دیا۔ احمد فراز کی ترقی پسند سوچ صرف اپنے اردگرد کے ماحول پر ہی محدود نہیں رہی۔ بلکہ انہوں نے ویتنام اور فلسطین کے مظلوم عوام کے مصائب کو بھی اپنا غم اور اپنا دکھ سمجھا۔ انہیں معلوم ہے کہ فلسطینیوں پر ظلم کی سیاہ رات مسلط کرنے والے کون ہیں؟ کون ہیں جنہوں نے فلسطینیوں کو بے گھری کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے؟ اور اسکے ساتھ ساتھ محفوظ پناہ گاہوں میں چھپے ہوئے اپنوں کے چہرے بھی ان کی نگاہ سے چھپ نہ سکے۔ فراز یہ سمجھتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی یہی سمجھانا چاہتے ہیں کہ اصل دشمن جو ہیں سو ہیں مگر اپنی صفوں میں چھپے ہوئے

دوست نما دشمنوں کے چہروں سے بھی نقاب اٹھانی چاہیئے ۔ اسّی کی دہائی میں جب بیروت جل رہا تھا تو احمد فرازؔ نے ان مکروہ چہروں سے نقاب اٹھائی اور فلسطینیوں پر ہونے والے ظلم وستم پر آوازِ احتجاج بلند کی۔

وہ ایک محبِ وطن شاعر ہیں اور اسی لئے وطن کے دکھ درد اور غموں کو وہ اپنا دکھ درد سمجھتے ہیں۔ وہ ایک ترقی پسند شاعر ہیں اور اپنے ملک کے عوام کے بہتر مستقبل کے لئے ایک منصفانہ معاشرے کے قیام کو ضروری سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں ہونے والی تمام جمہوری جدوجہد میں وہ اپنی شاعری کے حوالے سے، اپنے لوگوں کے ہم آواز رہے ہیں۔ اور اسی لئے فیضؔ احمد فیضؔ اور حبیب جالبؔ کی طرح وہ بھی پاکستانی احتجاجی شاعری کے ہراول دستے میں شامل رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں جب اپنے لوگوں کے ہاتھوں، اپنوں پر ظلم ہوا اور ملک کا یہ حصہ ایک نئے نام سے اپنی شناخت کا حقدار ہوا تو فرازؔ نے بڑے دکھ سے کہا تھا:

پھر یوں ہوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہوگئے

فرازؔ ، اندر کی ان نفرتوں کو محبت میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک بہتر اور خوشحال پاکستان کا خواب اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب اس ملک کے عوام کو ان کے بنیادی انسانی حقوق میسّر ہوں۔ وہ آمریت کے پودے کو کسی بھی حالت میں پھلتا پھولتا نہیں دیکھنا چاہتے کہ جب یہ پودا پھلتا پھولتا ہے تو امن اور انصاف کی کلیاں مرجھا جاتی ہیں۔ ان کی شاعری کے سلسلے وار مطالعے

سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے نے انکی حب الوطنی کے جذبوں کو جھنجھوڑ کر رکھدیا۔ ۶۵ء اور ۷۱ء کی جنگوں میں ایک جذباتی محب وطن شاعر کی حیثیت سے فراز نے اپنے سینوں پر شوقِ شہادت کے تمغے سجانے والوں کے لیے اپنے پیار اور خلوص کے موتی نچھاور کیے تھے لیکن سقوطِ ڈھاکہ کے بعد وہ آنکھ بند کر کے کسی بھی ایسی حب الوطنی کے گیت گانے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے۔ چنانچہ جب ایک جمہوری حکومت کے دور میں، اپنے اقتدار کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے ملک کے چند شہروں میں "منی مارشل لا" لگا دیا گیا تو فراز نے اس واقعے پر بڑی پر سوز صدائے احتجاج بلند کی۔ ان کی نظم "پیشہ ور قاتلو" ان کی احتجاجی اور سیاسی شاعری کا سنگِ میل قرار دی جا سکتی ہے۔ اس نظم کا چھپنا تھا کہ اربابِ اقتدار کی محفوظ ایوانوں میں جیسے زلزلہ سا آ گیا- یہاں اس بات کی وضاحت بھی ہو جائے کہ فراز کی یہ نظم اس وقت تک کہیں شائع بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ نظم سینہ بہ سینہ لوگوں کے دلوں کی شاہراہوں پر سفر کرتی ہوئی وہاں تک پہنچی تھی اور جسکے نتیجے میں فراز پر بغاوت کا الزام لگا کر انہیں داخلِ زنداں کر دیا گیا۔ پاکستان سے شائع ہونے والے کسی بھی مجموعے میں یہ نظم شامل نہیں ہے لیکن جو لوگ فراز کو جانتے ہیں اور انکی شخصیت کے پیچ وخم کو پہچانتے ہیں وہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ فراز کی شخصیت میں بزدلی کی کوئی روایت نہیں ہے۔ چنانچہ جیسے ہی وطن سے باہر انکی نظموں کے انگریزی تراجم banished dreams شائع ہوئی تو اس کتاب میں یہ نظم انتہائی وقار کے ساتھ شائع ہوئی۔

پیشہ ور قاتلو

میں نے اب تک تمہارے قصیدے لکھے
اور آج اپنے نغموں سے شرمندہ ہوں
اپنے شعروں کی حرمت پہ ہوں منفعل
اپنے فن کے تقاضوں سے شرمندہ ہوں
پا بہ زنجیر یاروں سے نادم ہوں میں
اپنے دل گیر پیاروں سے شرمندہ ہوں
جب کبھی بھی مری دل زدہ خاک پر
سایہء غیر یا دستِ دشمن پڑا
جب بھی قاتل مقابل صف آرا ہوئے
سرحدوں پر مری جب کبھی رن پڑا
میرا حرفِ ہنر تھا کہ خونِ جگر
نذر میں نے کیا مجھ سے جو بن پڑا
آنسوؤں سے تمہیں الوداعیں کہیں
رزم گاہوں نے جب بھی پکارا تمہیں
تم نے جاں کے عوض آبرو بیچ دی
ہم نے پھر بھی کیا ہے گوارا تمہیں
تم ظفر مند تو خیر کیا لوٹتے

ہار میں بھی نہ دل سے اتارا تمہیں
سینہ چاکان مشرق بھی اپنے ہی تھے
جن کا خوں منہ پہ ملنے کو تم آئے تھے
مامتاؤں کی تقدیس کو لوٹنے
یا بغاوت کچلنے کو تم آئے تھے
ان کی تقدیر تم کیا بدلتے مگر
ان کی نسلیں بدلنے کو تم آئے تھے
اس کا انجام جو بھی ہوا سو ہوا
شب گئی خواب ہائے پریشاں گئے
کس رعونت کے تیور تھے آغاز میں
کس خجالت سے تم سوئے زنداں گئے
تیغ در دست کف در دہاں آئے تھے
طوق در گردن و پا بہ جولاں گئے
میں نے پھر بھی تمہیں بے خطا ہی کہا
خلقت شہر کی دل دہی کے لیے
اپنی بے آسرا خاک کے واسطے
اپنے بے آس لوگوں کے جی کے لیے
گو مرے شعر زخموں کے مرہم نہ تھے

پھر بھی اک سعیٔ چارہ گری کے لیے
یاد ہوں گے تمہیں پھر وہ ایام بھی
جب اسیری سے تم لوٹ کر آئے تھے
ہم دریدہ جگر راستوں میں کھڑے
اپنا دل اپنی آنکھوں میں بھر لائے تھے
اپنی تحقیر کی تلخیاں بھول کر
تم پہ توقیر کے پھول برسائے تھے
کیا خبر تھی کہ تم سے شکستہ انا
اپنے زخموں کو بس چاٹنے آئیں گے
جن کے جبڑوں کو اپنوں کا خوں لگ گیا
ظلم کی سب حدیں پاٹنے آئیں گے
قتلِ بنگال کے بعد بولان میں
شہریوں کے گلے کاٹنے آئیں گے
اب پشاور سے لاہور مہران تک
تم نے مقتل سجائے ہیں کیوں غازیو
کس شہنشاہِ عالی کا فرمان ہے
کس کی خاطر ہے یہ کشت و خوں غازیو
کس کی ایما پہ ہے اتنی غارت گری

کس کے آگے ہو تم سرنگوں غازیو
جیسے برطانوی راج میں گورکھے
باغیوں پر ستم عام ان کے بھی تھے
جیسے سفاک گورے تھے ویتنام میں
حق پرستوں پہ الزام ان کے بھی تھے
آج تم ان سے کچھ مختلف تو نہیں
رائفلیں وردیاں نام ان کے بھی تھے
تم نے دیکھے ہیں جمہور کے قافلے
ان کے ہاتھوں میں پرچم بغاوت کے ہیں
ہڈیوں پر جمی پپڑیاں خون کی
کہہ رہیں ہیں کہ منظر قیامت کے ہیں
کل تمہارے لیے پیار سینوں میں تھا
اب جو شعلے اٹھے ہیں وہ نفرت کے ہیں
آج شاعر پہ بھی قرض مٹی کا ہے
اب قلم میں لہو ہے سیاہی نہیں
خول اترا تمہارا تو ظاہر ہوا
پیشہ ور قاتلو تم سپاہی نہیں
اب سبھی بے ضمیروں کے سر چاہییں

اب فقط مسئلہ تاج ۔ شاہی نہیں

زنداں کی سلاخوں کے پیچھے فیض و جالب ہی کی طرح فرازؔ کو بھی اس نظم کی پاداش میں قیدِ تنہائی کے مرحلوں سے گزرنا پڑا تھا۔ آنکھوں پر کئی کئی دن اور کئی کئی رات جب سیاہ پٹی بندھی ہو اور پھر اچانک قیدِ تنہائی کے سیل سے کسی فاختہ کی آواز کانوں میں آ جائے تو دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے:

قفس میں روزنِ دیوار و زخمِ در نہیں لیکن
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے

فرازؔ محبت کی اس پہلی آواز کو کیسے بھول سکتے تھے قیدِ تنہائی میں محبت کی اس پہلی آواز کو سن کر چھ مصروں کی ایک نظم لکھ کر انہوں نے اردو شاعری کو ایک انمول تحفہ دیا ہے۔

ایسا سناٹا کہ جیسے ہو سکوتِ صحرا
ایسی تاریکی کہ آنکھوں نے دہائی دی ہے
جانے زنداں سے ادھر کون سے منظر ہوں گے
مجھ کو دیوار ہی دیوار دکھائی دی ہے
دور اک فاختہ بولی ہے بہت دور کہیں
پہلی آواز محبت کی سنائی دی ہے

۱۹۷۷ء کے ابتدائی دنوں میں لگنے والا ''منی مارشل لا'' بالآخر ایک بڑے اور مکمل مارشل لا پر منتج ہوا۔ پورے ملک پر آمریت کے پنجے مضبوطی سے گڑے

ہوئے تھے کہیں سے کوئی صدائے احتجاج نہیں آ رہی تھی۔ فیضؔ جیسے شاعر کو بھی وطن بدر ہونا پڑا اتنے نامسائد حالات نے بھی فرازؔ کے حوصلوں کو کمزور نہیں کیا۔ اور جب ایوانِ اقتدار سے دھمکیوں اور خوف وحراس کا پھندا فرازؔ کی گردن کی طرف بڑھنے لگا۔ تو انہوں نے ''محاصرہ'' جیسی بے مثال نظم لکھ کر اپنے مخالفوں بلکہ پورے ملک کے دشمنوں کو منہ توڑ جواب دیا۔ آمریت کے خلاف فرازؔ کی یہ جنگ جاری تھی مگر جب اسی دورِ پرآشوب میں پاکستان کے پہلے منتخب جمہوری وزیرِ اعظم کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا تو انکا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ انکے شعری مجموعے ''بے آواز گلی کوچوں میں'' ایک بدنما صبح کے بارے میں چند نظمیں ملتی ہیں ان نظموں میں خون کے آنسوؤں کے دھبے دیکھے جا سکتے ہیں:

لبابِ دار نے منصب نیا دیا ہے اُسے
وہ آدمی تھا مسیحا بنا دیا ہے اُسے
سفر طویل نہ درپیش ہو مسافر کو
جو نصفِ شب سے بھی پہلے جگا دیا ہے اُسے
کچھ اپنے شہر کا قاتل بھی بے مروّت تھا
کچھ اپنے عجز نے بھی حوصلہ دیا ہے اُسے
فغاں کہ اہلِ ہوس کی رقابتوں نے فرازؔ
جو شخص جانِ جہاں تھا گنوا دیا ہے اُسے

فرازؔ شاعری کا گلدستہ لیکر اپنے محبوب شہر کراچی پہنچے تو اربابِ اقتدار

نے ان کے ہاتھوں میں سندھ بدری کا پروانہ تھما دیا۔ اپنے ہی ملک کے ایک حصے میں جب ایک محب وطن شاعر کے رستے پر کانٹوں کی باڑھ لگا دی جائے تو پھر اس فضا میں اسکا دل کیسے لگ سکتا ہے۔ فرازؔ نے بھی رختِ سفر باندھ لیا اور فیضؔ کے راستے پر چل پڑے۔ اب کراچی، لاہور، اور پشاور میں ان کا بسیرا نہ تھا بلکہ لندن، ٹورنٹو، اور واشنگٹن انکے نئے مسکن تھے۔ احمد فرازؔ اپنے پاؤں میں جلاوطنی کی زنجیر پہنے ہوئے ایک شہر سے دوسرے شہر، قریہ قریہ، گلی گلی، گریباں چاک کئے ہوئے گھومتے رہے۔ اور پاکستان سے باہر پاکستان کی محبت کے گیت گاتے رہے۔ لوگوں کو بیدار کرتے رہے۔ آمریت کے خلاف کھل کر بولے، اور بے خوف وخطر بولے۔ صرف آمروں کے خلاف ہی نہیں بولے بلکہ اپنے قبیلے کے اُن لکھنے والوں کے خلاف بھی کھل کر بولے جو مصلحتوں کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے۔

کسی شاعر کے قلم سے آمروں کی زبانیں تو نہیں کھینچی جاسکتیں لیکن یہ ضرور ہے کہ آمریت کے قلعے میں وہ دراڑیں ضرور ڈالی جا سکتی ہیں جن سے چھن کر آنے والی روشنی میں بے زبان مخلوقِ خدا اپنا اصلی چہرہ دیکھ سکتی ہے۔ اپنے جذبوں کو زبان دے سکتی ہے۔ اپنے آدرش کو زندہ رکھ سکتی ہے۔ اور جلاوطنی کے دنوں میں فرازؔ نے اپنی شاعری سے یہی کام لیا۔ فرازؔ کی شاعری نے فیضؔ اور جالبؔ کی شاعری کے ساتھ مل کر سیاسی شاعری کی ایک ایسی مثلث ترتیب دی جس نے پاکستان میں احتجاجی ادب کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ یہ احتجاجی اور سیاسی شاعری صرف غم وغصے کی شاعری نہیں ہے۔ یہ شاعری انسانی ذہنوں میں امن کے دیپ بھی جلاتی

ہے۔ پیار کے پھول بھی کھلاتی ہے۔ اور دوستی کے چمن بھی مہکاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ۱۹۴۸ء میں جہادِ کشمیر میں ایک رضاکار کے طور پر حصہ لینے والا شاعر اپنے نئے ذہنی افق کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان میں دوستی، یکجہتی، پیار، محبت اور بھائی چارے کا پیغامبر نہ بنتا۔ امن کے جو خواب احمد فراز کی آنکھوں میں ہیں ان خوابوں کو انکی تعبیر ضرور ملے گی اور فیض کی یہ پیشن گوئی اگر آج نہیں تو کل ضرور سچ ثابت ہوگی کہ:

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

ابھی کچھ دن پہلے جب پاک و ہند کی موجودہ سیاسی قیادتوں کو امن اور دوستی کا خیال آیا تو احمد فراز کی آواز بھی اس میں شامل ہوگئی۔ اہلِ سیاست اپنا کام کرتے ہیں اور اہلِ محبت اپنا پیغام دیتے رہتے ہیں۔ بقول جگر مرادآبادی:

ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

نقطۂ نظر
(احمد فراز اپنے انٹرویو اور بیانات کی روشنی میں)

ایک زمانہ تھا کہ ہم کسی شاعر یا ادیب کے خیالات جاننے کے لیے اس کی شعری یا نثری تخلیقات کے علاوہ اس کے لکھے ہوئے خطوط یا اس کی سوانح یا اس کے بارے میں لکھے گئے مضامین ہی پر بھروسہ کرتے تھے مگر زمانے کے ساتھ ساتھ اس صورتِ حال میں بھی تبدیلی آئی - اب یہ دور انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی کا دور ہے' ذرائع ابلاغ میں بے پناہ وسعت ہو چکی ہے- اس وسعت نے ہمارے لیے کئی آسانیاں پیدا کر دی ہیں اور ان میں سے ایک بہت بڑی آسانی' تخلیق کار سے براہِ راست انٹرویو کا سلسلہ بھی ہے- انٹرویو کے ذریعے کیے جانے والے سوالات اور ان کے جوابات ریڈیو' ٹیلی ویژن' اخبارات اور رسالوں کے ذریعے عام لوگوں تک پہنچتے ہیں- اس طرح ایک عام آدمی کو اپنی پسندیدہ یا ناپسندیدہ دونوں طرح کی شخصیتوں کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں - انھی معلومات کی بنیاد پر کسی شخصیت کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جاتی ہے- یوں

دیکھا جائے تو کسی بھی لکھنے والے کے خیالات' اس کے نظریات اور اس کے بنیادی موضوعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا یہ ایک بہت گراں قدر وسیلہ ہے۔ اگر اس وسیلہء اظہار کی راہوں میں کردار کشی اور بد طینتی کے کانٹے نہ بچھے ہوں تو کوئی بھی انٹرویو اپنے اصل مفہوم کے قریب ہو سکتا ہے اور اس طرح کسی شخصیت کی تفہیم میں پیدا ہونے والے اُلجھاوے دور ہو سکتے ہیں۔

معلومات کے اس ذریعے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم اپنے دور کے ایک نہایت مقبول اور کسی حد تک متنازعہ شخصیت کے حامل احمد فراز کے خیالات اور نظریات کی چھان پھٹک کریں تو بہت ساری غلط فہمیوں کی خود بخود تردید ہو جائے گی اور بہت ساری چیزیں اپنے اصل سیاق وسباق میں روشن سے روشن تر ہوتی چلی جائیں گی۔ یہ ضرور ہے کہ اکثر و بیشتر موقعوں پر ان کے نقطہء نظر کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے لیکن پھر بھی ان کے انٹرویو' ان کے بیانات اور ان پر شائع ہونے والے بہت سے خصوصی نمبروں کے صفحات پر ان کے صحیح فکری خدوخال بہ آسانی ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ بہت سے موقعوں پر ایسا ہوا ہے کہ ایک ہی قسم کے سوالات مختلف پیرایوں میں کئے گئے ہیں اور جوابات کی قوس وقزح کے رنگ بھی کہیں کہیں مختلف نظر آئے ہیں۔ مگر ایسا ہونا ایک فطری امر ہے۔ اصل چیز جو ہمیں دیکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم ان جوابات میں پنہاں ان کے خیال کی روح یا مقصد کی تلاش کا عمل بھی جاری رکھیں۔ اس طرح بظاہر نظر آنے والا تضاد ایک معنوی اکائی کی شکل اختیار کر لے گا۔ یہ فکری اکائی اگر کھل کر نہیں تو بین السطور میں ضرور بول اٹھے گی۔

اپنے بیانات' انٹرویو یا تخلیقات کے حوالے سے اکثر و بیشتر احمد فراز صاحب کی شخصیت متنازعہ رہی ہے- ظاہر ہے کہ جو بولے گا اور کھل کر بولے گا تو اسی کے زبان و بیان اور موضوع کو ہی گرفت میں لایا جا سکے گا- سو احمد فراز صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا- اس کے باوجود ان کے انٹرویو میں ان کی شخصیت کی نظریاتی اساس ایک روشن لکیر کی طرح نظر آتی ہے- ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے یہ انٹرویو بے حد اہم ہیں-

بیشتر انٹرویو میں کیے جانے والے سوالات چند موضوعات ہی کے گرد گھومتے ہیں- وہی سوالات بار بار گھوم پھر کر کیے گئے ہیں کہ جن کے جوابات وہ پہلے ہی اپنے کسی نہ کسی انٹرویو میں دے چکے ہوتے ہیں- میری کوشش یہ ہے کہ وہ سوالات جو بار بار ان سے کیے گئے ہیں ان کی روشنی میں فراز صاحب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی جائے- چنانچہ ان سوالوں کو پیش نظر رکھ کر یہ انتخاب ترتیب دیا گیا ہے-

کیا احمد فراز کافر اور ملحد ہیں؟

احمد فراز سے کیے جانے والے مختلف انٹرویو میں یہ سوال یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور سوال کئی موقعوں پر کیا گیا ہے- اس سوال کا جواب انہوں نے نہایت وضاحت سے دیا ہے اور اس بات سے قطعی انکار کیا ہے کہ وہ مذہب کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں- البتہ مذہب کے نام پر کسی بھی معاشرے میں ہونے والی

لوٹ کھسوٹ کے وہ پرزور مخالف رہے ہیں۔ اسلام کا جو ایک ترقی پسند پیغام عام انسانوں کے لیے ہے اسے انہوں نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ان کے شعری مجموعوں میں نعت وسلام کی شمولیت ہی اس بات کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ رثائی ادب کے ان نمونوں میں یہ بات محسوس کی جا سکتی ہے کہ ان کے ممدوح امام حسین ہوں یا پیغمبر اسلام، وہ ایک انقلابی فکر اور برتر انسانیت کے نمونوں کے طور پر ابھرتے ہیں اور ان کرداروں کی عظمت کے آگے احمد فراز کا سرِ تسلیم خم نظر آتا ہے۔
اپنے اوپر لگنے والے ملحدانہ اور کافرانہ الزامات کے ضمن میں ایک انٹرویو میں اس سوال کا جواب احمد فراز یوں دیتے ہیں کہ "مجھ پر بہت سے الزامات میں سے ایک الزام یہ بھی ہے کہ میں ملحد ہوں، بے دین ہوں، اسلام دشمن ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جہاں اور جگہوں پر اچھے لوگ موجود ہیں اس میں کچھ شک نہیں کہ مولوی صاحبان میں بھی ایسے کچھ اچھے لوگ ہیں اور اس کے برخلاف بھی ہیں۔ تو جو مولوی کے خیالات سے ذرہ برابر انکار کرے وہ دشمنِ دین اور ملعون ہو جاتا ہے جبکہ اسلام نے تو منافق کو بھی کافر نہ کہنے کو کہا ہے اور اسے چھوٹ دی ہے۔
یہاں ایک امام صاحب جو اپنا ایک اخبار بھی رکھتے ہیں انہیں کسی سبب مجھ سے عناد تھا۔ انہیں چونکہ اشتہارات لینے ہوتے تھے اس لیے انہوں نے کہا کہ فراز کے خلاف یہ کرو، وہ لکھو تاکہ اشتہارات آسانی سے ملنے لگیں۔ انہوں نے مجھ پر ایڈیٹوریل تک لکھے اور کہا کہ فتاویٰ جہانگیری کی رو سے میرا قتل بھی واجب ہے۔ پھر انہوں نے مسجدوں میں کچھ اماموں سے میرے خلاف خطبے بھی دلوائے۔ میں

دوسرے امامین سے کچھ نہیں کہتا وہ شاید معصوم تھے- کیونکہ اگر کسی بھی مسلمان سے کہا جائے کہ کوئی شخص اسلام کا تمسخر اڑاتا ہے' واہی تباہی بکتا ہے اور دشمن دین ہے تو ظاہر ہے اس شخص کا پہلا تاثر تو غصے اور نفرت ہی کا ہوگا- وہ اگر مجھ سے تصدیق کر لیتے تو اچھا ہوتا- ایک اور روز یر صاحب نے میری نعت پر فتویٰ لگا دیا کہ نعوذ باللہ میں اسلام اور رسول اللہ کے خلاف ہوں حالانکہ بعد میں میری اس نعت کو اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی بھیجا گیا اور وہاں سے بھی یہ جواب آ گیا کہ اس میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے مگر میں معتوب ہی رہا- میرے حق میں اسلامی نظریاتی کونسل کے جواب کو بھی قابلِ اعتبار نہیں سمجھا گیا پھر وہ نعت چٹان میں بھی چھپی اور انہوں نے یہ نوٹ لگایا کہ اس میں کوئی ایسی قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے مگر میں پھر بھی معتوب ہی رہا،، احمد فراز کے اس جواب کی روشنی میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر اس نعت کو دوبارہ پڑھیں اور دیکھیں کہ اس میں خلافِ اسلام کیا بات ہے؟

مرے رسول کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شبِ ظلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں

دل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے

یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام

تو ہمکلام رہا ہے زمین والوں سے

مگر یہ مفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہ

جو معتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے

خدا کے نام کو بیچیں مگر خدا نہ کرے

اثر پذیر ہوں خلقِ خدا کے نالوں سے

نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مشکبو ہے لباس

کہ میرے دل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے

ہے ترش رو مری باتوں سے صاحبِ منبر

خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے

مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا

میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

میں بے بساط سا شاعر ہوں پر کرم تیرا

کہ باشرف ہوں قبا و کلاہ والوں سے

ظاہر ہے کہ ادب کی معمولی سی شد بد رکھنے والا بھی اس نعت کو کسی اعتبار سے توہینِ رسالت کے دائیرے میں نہیں داخل کرے گا -ہاں اس میں احتجاج کی ایک لے ہے، درد کی ایک کسک ہے آرزومندی کے بکھرے ہوئے خواب ہیں اور

ان سب کے نتیجے میں جو ایک فضا بنتی ہے وہ سراسر مبنی بر خلوص ہے۔ اس میں عقیدت کے جذبے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس میں کہیں کہیں اس وقت کے آمر حکمراں پر ضرب پڑتی تھی جس کے کاسہ لیسوں نے یہ الزام تراشیاں کی تھیں۔ مثلاً "سرے والے سیاں" کے بارے میں یہ اشارہ تو اس مصرعے میں بہر حال ہے کہ:

نہ میری آنکھ میں کاجل ' نہ مشکبو ہے لباس

اسی طرح امام حسین کی بارگاہ میں سلام پیش کرتے ہوئے ان کی انقلابی طبیعت اور عقیدت کا دریا جوش میں آتا ہے۔

حسین تجھ پہ کہیں کیا سلام ہم جیسے
کہ تو عظیم ہے بے ننگ و نام ہم جیسے
برنگِ ماہ ہے بالائے بام تجھ جیسا
تو فرشِ راہ کئی زیرِ بام ہم جیسے
وہ اپنی ذات کی پہچان کو ترستے ہیں
جو خاص تیری طرح ہیں نہ عام ہم جیسے
یہ بے گلیم جو ہر کربلا کی زینت ہیں
یہ سب ندیم یہ سب تشنہ کام ہم جیسے
بہت سے دوست سرِ دار تھے جو ہم پہنچے
سبھی رفیق نہ تھے سست گام ہم جیسے

خطیب شہر کا مذہب ہے بیعتِ سلطاں
ترے لہو کو کریں گے سلام ہم جیسے
تو سر بریدہ ہوا شہرِ نا سپاساں میں
زباں بریدہ ہوئے ہیں تمام ہم جیسے
چمن کے خرقۂ خوں بھی کشیدہ سر ہیں فراز
بغاوتوں کے علم تھے مدام ہم جیسے

احمد فراز نے اپنے ایک انٹرویو میں اسلام کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت ایک اور جگہ پر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے دین میں جو وسعت ہے وہ دنیا کے کسی دین میں نہیں ہے لیکن جس طرح ہندو معاشرے میں برہمن کو ہی یہ حق ہے کہ وہ تعلیم حاصل کرے بالکل اسی طرح" ہمارے اندر بھی بہت سے لوگ برہمنوں کا روپ دھارے بیٹھے ہیں۔ بہت سے جاہل لوگ بدعتیں اور خرافات پھیلائے بیٹھے ہیں کیوں کہ انہوں نے اسلام کی آڑ میں کھانے کمانے کا سلسلہ چلا رکھا ہے۔ ایک بار ہم ایک گاؤں گئے وہاں ہم نے ایک بی بی سے پوچھا کہ آپ نے قران پڑھا ہے تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا توبہ توبہ ہم کہاں قران پڑھ سکتے ہیں یہ تو ہمارے پیر بابا ہی پڑھ سکتے ہیں"

اس طرح کے واقعات جب ایک پڑھے لکھے اور سوچنے سمجھنے والے شخص کے سامنے آتے ہیں تو وہ اس کا ردِ عمل بھی ظاہر کرتا ہے۔ احمد فراز بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ شاعر اور ادیب سے تو لوگوں کو یہ توقع ہوتی

ہے کہ وہ زندگی کے ان مسائل میں ان کی رہبری کا بھی فریضہ انجام دیں۔ اسی پس منظر میں تو اقبال نے 'دیدہ ء بینائے قوم' کی ترکیب استعمال کی تھی۔

کیا احمد فراز ایک محبِ وطن شاعر ہیں؟

احمد فراز کی حب الوطنی بھی اکثر و بیشتر SON OF THE SOIL ہونے کے باوجود مشکوک ہی رہی ہے۔ اس حوالے سے بھی ان سے کئی موقعوں پر سوالات کیے گئے ہیں اور ان کے جوابات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وطن دوستی اور وطن پرستی کا ان کا اپنا ایک خاص نقطہء نظر ہے، جو بہت سے لوگوں کو ناپسند ہے۔ بہت سوں کے لیے یہ وطن دشمنی کے مترادف ہے، مگر بقول فیض

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

احمد فراز اس سوال کے جواب میں زیادہ تر جذباتی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے جوابات میں بھی ایک خاص قسم کی شدت اور درد و کرب محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ''مجھے کسی سے اپنی حب الوطنی اور اسلام کا سرٹیفکٹ نہیں لینا ہے۔ ہمارے آباو اجداد اسی زمین میں دفن ہیں اور میں نے اپنے قلم سے عہد کر رکھا ہے کہ چاہے نتائج کچھ بھی ہوں میں ہمیشہ سچ کہوں گا۔ میں چونکہ چھوٹا آدمی ہوں لہٰذا معتوب ہوں ورنہ اقبال اور فیض نے بھی ہر دور میں صاف صاف کہا ہے مگر وہ اس لیے بچ گئے کہ وہ عالمی پیمانے پر جانے پہچانے جاتے تھے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ میں جس بات پر

معتوب ہوں وہی بات وہ کہیں تو ان کی عزت ہے انہیں بلا کر عہدے پیش کیے جاتے ہیں اور آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ میں کبھی گلٹی نہیں ہوا' کبھی ضمیر کے سامنے نادم نہیں ہوا۔ میں نے ہر قسم کے حالات سے گزرنے کے باوجود شکایت نہیں کی اور یا تب کہتا ہوں جب لوگ مجھے کہتے ہیں کہ اب بات حد سے گزر چکی ہے۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرے خلاف تو ہر قسم کی باتیں چھپ جاتی ہیں اور بعض کے اپنے اخبار بھی ہیں وہ جو چاہیں چھاپ سکتے ہیں مثلاً وہ اخبار جس کی 'جنگ' سے چل رہی ہے اور جس نے میرے خیال میں اس ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ انہوں نے میرے خلاف بہت غلط خبر چھاپی ہے مگر اصل بات کوئی نہیں چھاپتا'' حب الوطنی کے حوالے سے جب ایک بار ان سے کسی نے سوال کیا تو اس کے جواب میں احمد فراز نے خود ایک سوال قائم کیا اور پوچھا ''میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ جب کسی کو ملک دشمن کہا جاتا ہے تو کن محرکات کے سبب کہا جاتا ہے۔ میں جمہوریت کی' سچائی کی اور علم کی بات کرتا ہوں' مفلسی اور غربت دور کرنے کی بات کرتا ہوں اور سرمایہ دار کے خلاف کچھ کہتا ہوں تو کیا یہ غیر محبِ وطن ہونے کی نشانی ہے؟

ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب سیدھے سادھے لفظوں میں تو دیا نہیں جا سکتا کیوں کہ حُبِ وطن کا معیار کون متعین کر سکتا ہے۔ کسی ملک کے قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اگر کوئی شخص اپنی آزادیٔ اظہار کا حق استعمال کرتا ہے تو اسے کسی بھی طرح غیر محبِ وطن نہیں کہا جا سکتا۔ بدقسمتی سے پاکستان میں کمزور سیاسی نظام کی وجہ سے اکثر و بیشتر اہلِ قلم کو اس تکلیف دہ صورتِ حال سے گزرنا پڑا ہے۔

فیض نے اسی پس منظر ہی میں تو کہا تھا - نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں - چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے - جلاوطنی کے دنوں میں احمد فراز بھی اسی تکلیف دہ صورتِ حال سے گزرے - انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ "میرا بھی اس ملک پر اتنا ہی حق ہے جتنا دوسرے لوگوں کا ہے - تو جس بات کے لیے میں کوالیفائی کرتا ہوں تو میرا حق بنتا ہے کہ میں اس پر رہوں - ظاہر ہے مجھے زندہ رہنا ہے اور مجھے کچھ کرنا ہے تو جو کام میں جانتا ہوں میں وہی کرنا چاہوں گا" چنانچہ احمد فراز نے قلم ہاتھوں میں لیا اور اسے ایک امانت کے طور پر استعمال کیا - جب ہی تو محاصرہ والی نظم میں کہا تھا کہ مرا قلم مری سب سے بڑی عدالت ہے -

احمد فراز کی وہ شاعری جو سیاسی شاعری کے دائرے میں آتی ہے - اس کا لہجہ احتجاجی ہے اور جب اس احتجاجی لہجے میں اشعار کہے گئے تو حکومتِ وقت کے حامی صحافیوں، کالم نگاروں اور میڈیا سے تعلق رکھنے والوں نے اس صدائے احتجاج کی پرزور مخالفت کی - جلاوطنی کے دوران جب وہ ایک بار ہندوستان گئے تو ان دنوں دہلی کے پاکستانی سفارت خانے میں ڈاکٹر حسن رضوی نے ان سے انٹرویو لیتے ہوئے ایک سوال پوچھا کہ کیا آپ پاکستانی اخباروں میں اپنے بارے میں چھپنے والی خبروں سے آگاہ ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ "صرف چند خبروں ہی سے نہیں چند کالموں سے بھی آگاہ ہوں - میں جانتا ہوں کہ مجھ پر ملک دشمنی اور غیر محب وطن ہونے کے الزام لگائے گئے ہیں - اگر میں غیر محب وطن ہوتا تو یومِ پاکستان کی اس تقریب میں نظر نہ آتا - پاکستان ہمارے وجود کا حصّہ ہے - ہم اس سے

علاحدہ ہو کر کہیں بھی سکون نہیں پا سکتے - میں ان لوگوں کے پاسپورٹ دیکھ کر خوف سے کانپ جاتا ہوں جنہوں نے غیر ملکوں میں سیاسی پناہ لے رکھی ہے - ان سپورٹوں پر لکھا ہوتا ہے- تمام ملک سوائے پاکستان- میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا- پاکستان میرا وطن ہے اور میں دنیا میں اسی کے پاسپورٹ پر سفر کرتا ہوں - ایک اور سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ" ایک کالم نویس نے میری پرانی نظم" اے بھوکی مخلوق" کو بنیاد بنا کر یہ لکھا کہ یہ میری تازہ نظم ہے اور میں نے اس میں پاکستان کے خلاف باتیں لکھی ہیں- حالانکہ یہ نظم میرے مجموعے" تنہا تنہا " میں چھپ چکی ہے اور اتفاق سے اس کے اختتام پر ۱۴ اگست ۱۹۵۴ کی تاریخ بھی شائع ہوئی ہے- ایک کالم نویس نے اس کی تاریخ کو نظر انداز کر کے اسے میری تازہ نظم قرار دیا- جہاں تک پاکستان کے خلاف ہونے کی بات ہے تو تاریخ گواہ ہے کہ ۶۵ ء اور ۷۱ ء کی جنگوں میں لکھے گئے میرے قومی نغمے اور ترانے" شب خون" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں،،

اپنی حب الوطنی کے حوالے سے احمد فراز نے ایک جگہ بہت ذاتی نوعیت کا ایک دلچسپ واقعہ بھی بیان کیا ہے لیکن اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ وطن اور وطن سے محبت کے معیارات ان کی نظر میں کیا ہیں- کہنے لگے کہ ایک تقریب میں ایک خاتون انہیں پان کھلانے پر بہت بضد تھیں تو میں نے انہیں بتایا کہ میں پان نہیں کھایا کرتا- انہوں نے کہا کہ تم تو پان کھایا کرتے تھے- میں نے کہا ہاں کھایا تو کرتا تھا مگر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء جب سے ڈھاکہ فال ہوا ہے اس دن سے میں نے

پان نہیں کھایا کیونکہ پان سے میری ایسوسی ایشن مشرقی پاکستان سے تھی۔ یہ سن کر وہ خاتون دم بخود رہ گئیں اور پھر کہنے لگیں کہ جس دن وہ مجھے پان کھاتے ہوئے دیکھ لیں گی تو وہ سمجھیں گی کہ اب مجھے ملک سے دلچسپی نہیں رہی۔ بظاہر یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جسے انہوں نے یوں ہی رواروی میں انٹرویو دیتے ہوئے بیان کردیا لیکن اس واقعے سے وطن کے بارے میں احمد فراز کے جذبات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص کسی ایک موضوع پر اس قدر جذباتی ہوگا تو اس کی جھلک بھی اس کی شاعری میں نظر آئے گی۔ چنانچہ جب وہ اپنے اس وطن کو اپنی آنکھوں میں سجے ہوئے خوابوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور اس میں انہیں کچھ خامیاں نظر آتی ہیں تو وہ اس پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ جب اس صدائے احتجاج کی لے ذرا تیز ہوجاتی ہے اور ایوانِ اقتدار میں اس کی گونج سنائی دینے لگتی ہے تو اس سے وابستہ لوگ اپنے رزق کی مصلحت کا شکار ہو کر جواباً انہیں وطن دشمن، غدار اور غیر محب وطن وغیرہ کہتے ہیں۔

احمد فراز کی ترقی پسندی کیا ہے؟

احمد فراز ایک ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں چنانچہ ان سے اس موضوع پر کوئی سوال پوچھے بنا کوئی انٹرویو کیسے مکمل ہو سکتا ہے؟ بہت سے انٹرویو کرنے والوں نے ان سے اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور ان کا جواب نہایت صاف اور دوٹوک رہا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں ترقی پسندی

سے متعلق کیے جانے والے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ''ترقی پسندی کے میں جو معنی لیتا ہوں وہ ترقی پسندی ہی ہے- آپ تاریخ کے کیلینڈر کو پیچھے تو نہیں لے جا سکتے -ہر شخص اپنے افکار میں اپنے فن میں اور دنیا میں آگے ہی بڑھنا پسند کرتا ہے- ترقی ہی کرنا پسند کرتا ہے- پرانے زمانے کی جو جہالت سرمایہ داری اور جاگیرداری ہے ان کے خلاف جدوجہد کرنا' مخلوقِ خدا کو ان کے چنگل سے نکالنا' اس کی سوچ کو آگے بڑھانا میرے نزدیک ترقی پسندی ہے'' ایک اور جگہ انہوں نے اپنے ترقی پسند نظریات وخیالات کا اظہار زیادہ واضح لفظوں میں یوں کیا ہے'' وہ لوگ جن کا شاعری میں کوئی نصب العین نہیں ہے اور شاعری کو صرف تفریح کی حیثیت سے لیتے ہیں کہ بس واہ واہ ہو جائے تو میں انہیں برا نہیں کہتا مگر میں ان کی قدر کرتا ہوں جو کسی سوشل یا پولیٹکل پروگرام پر چلنے اور لوگوں کے اصل مسائل کو ڈسکس کرتے ہیں- مثال کے طور پر اقبال کو لیں- کیا انہوں نے شاعری کے ذریعے ایک پیغام لوگوں تک نہیں پہنچایا؟ انہوں نے تو اپنا سارا میسج شاعری ہی کے ذریعے دیا تھا- تو آج کے مسائل جو کہ ہم زیادہ واضح طور پر دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں تو یہ زیادہ بہتر ہے کہ شاعر کسی خاص اور مثبت نظریے پر کام کرے- میں پھولوں' پہاڑوں اور دریاؤں وغیرہ پر شاعری کرنا ناپسند نہیں کرتا- یہ چیزیں مجھے بھی عزیز ہیں مگر میں زیادہ تر انسانیت پر سوچتا ہوں- آج کل مسائل اتنے بڑھ چکے ہیں کہ ایک شاعر چاہے بھی تو ان سے خود کو نہیں ہٹا سکتا -مسائل ہر دور میں ہوتے ہیں غالب کے عہد میں بھی تھے مگر پھر بھی اس دور میں اس قدر نہیں تھے اور نا ہی دنیا کے دوسرے مسائل سے لوگ آج کی طرح بہرہ ور ہو سکتے

تھے آج کے عہد میں تو فاک لینڈ اور فلسطین کی خبریں بھی چند لمحے میں پہنچ جاتی ہیں۔
میں کمٹ منٹ کا شاعر ہوں۔ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں تاہم جو بھی شخص جو بھی نظریہ
میرے خیالات کو آگے بڑھانے میں اور لائن آف ایکشن دینے میں مدد کرے تو اس
سے کچھ وابستگی تو ہو جاتی ہے،، احمد فراز ادب کے ترقی پسند نظریے کو کسی تحریک سے
بھی آگے کی چیز سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے ایک سوال کے جواب میں انہوں
نے لندن میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''جس طرح قانون کی کتاب سے کہیں
آگے جا کے انصاف ہوتا ہے اسی طرح کسی تحریک کے منشور سے کہیں آگے جا کے
ادب ہوتا ہے۔ حضرت علی سے کسی نے پوچھا کہ ظلم کیا چیز ہے تو آپ نے فرمایا کہ کسی
چیز کو اپنی اصل جگہ سے ہٹا کر غلط جگہ پر رکھ دینا پھر پوچھا گیا کہ انصاف کیا چیز ہے تو
آپ نے فرمایا کہ جو چیز غلط جگہ پر رکھ دی گئی ہو اسے اس کی اصلی جگہ پر رکھ دینا۔ تو
بات یہ ہے کہ جہاں آپ دیکھیں کہ ظلم ہو رہا ہے یا سماجی ناہمواری اتنی بڑھ گئی ہے کہ
انسان ذلت کی حدوں کو چھو رہا ہے تو اس کے خلاف لکھیں،،

حقیقت یہ ہے کہ ظلم یا استحصال تو ایک اضافی قدر ہے ہر شخص کے
دیکھنے کا انداز جدا جدا ہو سکتا ہے جس کے نتیجے میں احتجاج کی راہیں بھی جدا جدا ہو سکتی
ہیں۔ اسی لیے کچھ لوگ مل کر ایک مشترکہ پلیٹ فارم بناتے ہیں' مشترکہ لائحہ عمل
بناتے ہیں تا کہ ان کے طے شدہ مقاصد کی تکمیل آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ اسی
ضرورت کے تحت انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اب اگر آج کے
بدلے ہوئے حالات میں تنظیم نہیں ہے یا زیادہ فعال نہیں ہے تو اسے موجودہ حالات

ہی کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ ویسے جہاں تک احمد فراز صاحب کا تعلق ہے تو وہ ابتدا ہی سے نہ صرف یہ کہ ترقی پسند خیالات کے حامی رہے ہیں بلکہ وہ تنظیمی سطح پر بھی اس تحریک سے وابستہ رہے ہیں۔ صوبہ سرحد میں جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کا قیام عمل میں آیا تو وہ پشاور کی ذیلی شاخ کے سکریٹری بھی رہ چکے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی کوشش کے اس پس منظر میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے سوال کو ذرا اور وسعت دیتے ہوئے احمد فراز نے کہا کہ ''اگر تحریک کی صورت میں اجتماعی طور پر ایک قافلے کی شکل میں آگے بڑھا جا سکتا ہو تو اس سے اچھی تو بات ہی کوئی نہیں۔ اس سے طاقت میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ صورت تو ایک طرح سے موجود بھی ہے گو بظاہر اس کا ڈھانچہ نظر نہیں آتا لیکن اگر غور کریں تو ہماری رفاقتیں جو غیر مرئی رشتوں میں پروئی ہوئی ہیں وہ ایک طاقت کی صورت میں موجود ہیں لیکن جہاں یہ محسوس کیا جائے کہ اجتماعی جدوجہد ممکن نہیں جیسا کہ پاکستان میں ترقی پسند تحریک پر پابندی ہے تو وہاں انفرادی طور پر جو آپ کر سکتے ہیں کریں مثلاً اگر ہم چار پانچ مل کر سچ نہیں بول سکتے تو ایک تو اپنے طور پر بول سکتا ہے۔ ویسے بھی کسی میں حوصلہ کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ' کیونکہ طاقت' حوصلہ اور علم میں انسان ایک دوسرے سے کمتر یا برتر ہوتا ہے،،

ترقی پسند تحریک کے بارے میں ڈاکٹر حسن رضوی سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے اس تحریک کو بڑے شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ'' ترقی پسند ادب کے الفاظ سے ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کوئی ایسا ادب تو نہیں جسے کسی خاص عرصے کے بعد مر جانا ہے۔ اس کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ زندگی کے نئے

تقاضوں کو اپنایا جائے۔ یہی سبب ہے کہ یہ تحریک باوجود اتنی دشواریوں رکاوٹوں اور پابندیوں کے آگے بڑھتی رہی اردو ادب کی کسی اور تحریک نے اتنے زندہ لکھنے والے پیدا نہیں کیئے جتنے اس تحریک نے پیدا کیئے۔ حالی اور آزاد نیچر سے آگے نہیں بڑھ سکے یا پھر کچھ امید اور خوشی کی باتیں انہوں نے کیں لیکن ہمارے عہد کے لکھنے والوں نے اس سے بہت آگے بات بڑھائی ہے اور اپنے وطن یا دنیا کے کسی بھی حصے میں اگر کوئی زیادتی' بے انصافی اور استحصال ہوا ہے تو اس کے خلاف لکھا ہے اور بھرپور لکھا ہے۔''

احمد فراز نے جلاوطنی کیوں اختیار کی؟

پاکستان میں جب ضیا الحق کا مارشل لا آیا تو وہ پہلے مارشل لا سے بالکل مختلف تھا۔ یہ صرف اقتدار پر قبضے کا قصہ نہیں تھا بلکہ پورے معاشرے کو ایک خاص انداز سے دیکھنے اور اس پر عمل کرنے کا منصوبہ تھا۔ چنانچہ پاکستانی معاشرے میں بنیادی تبدیلیوں کی ہوائیں چلنے لگیں۔ یہ وہی دور تھا جب فیض نے کہا تھا کہ

مرے دل مرے مسافر ۔ ہوا پھر سے حکم صادر۔ کہ وطن بدر ہوں ہم تم ....

فیض نے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے جلاوطنی کی جو راہ اختیار کی تھی اسی راستے پر احمد فراز نے بھی قدم رکھا۔ اپنی جلاوطنی کے اس دور کے بارے میں انہوں نے اس زمانے میں جب بھی اظہار خیال کیا اس میں اپنے دل کی کیفیت کے ساتھ ساتھ اس دور میں ہونے والے ظلم اور زیادتی کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ

انہیں زبردستی جلاوطنی کا راستہ اختیار کرنا پڑا بلکہ ہمیشہ بڑے دکھ کے ساتھ اس دور کے گھٹن آمیز ماحول کو اس کا ذمہ دار قرار دیا - اسی زمانے میں لندن میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ "میں ملک میں رہا مصائب جھیلے پھر بھی میں ملک نہیں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن ۱۹۸۲ء میں کراچی پریس کلب کے مشاعرے کے بعد جب مجھے سندھ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری نقل وحرکت پر بھی پابندی لگائی جارہی ہے اور میرے ملک کے بعض حصے بھی مجھ پر بند کیے جارہے ہیں - میری شاعری کرنے، پڑھنے اور شائع کرنے کے حق پر پہلے ہی پابندیاں تھیں اور یہ سندھ بدر کرنا اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوئی اور میں نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تاکہ آزادی سے لکھ سکوں اور اظہار کرسکوں"

جلاوطنی کے ان دنوں کی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ "میں نے اس عرصے میں عمر کے لحاظ سے اور اس معنی میں کہ میں اپنے پیاروں سے دور رہا یہ برس گنوائے ہیں لیکن میں نے اپنے تجربے اور علم میں اضافہ کرلیا ہے- میں نے ان برسوں میں ساٹھ کے قریب نظمیں لکھی ہیں- میری نوٹ بک بھری پڑی ہے- ان میں زیادہ تر ایک جلاوطن کے طور پر وطن سے میری دوری اور غم وغصے اور دنیا کے دوسرے حصوں میں جاری جدوجہد کے شعور اور ان کے ساتھ وابستگی کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے- سب سے قیمتی سرمایہ وہ محبت ہے اور وہ پیار ہے جو مجھے ملک سے باہر اپنے ہم وطنوں سے ملا ہے- میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پاکستان سے اتنی دور رہنے والے ہم وطن میری شاعری سے اتنے مانوس ہوں گے اور وطن سے اتنی

جذباتی وابستگی رکھتے ہوں گے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ شاعری اتنی طاقتور ہو سکتی ہے۔ برطانیہ' ناروے' سویڈن' کینیڈا اور امریکہ میں مجھے بار بار مدعو کیا گیا اور محبت اور تعریفوں کے پھول برسائے گئے۔ بھارت میں بھی ایسا ہی زبردست ردعمل تھا۔ میرے لیے یہاں زندگی زیادہ مشکل ہے اور پاکستان میں حکام میرے خاندان پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ مجھے منہ بند رکھنے پر آمادہ کریں۔ ایک مرحلے پر جب میں نے کینیڈا کے ٹیلی ویژن کو انٹرویو دیا تو انہوں نے میری بیوی کو بلایا اور خطرناک نتائج کی دھمکی دی لیکن میں نے اپنا منہ بند نہیں رکھا اور نا ہی اپنا قلم توڑا ،،

احمد فراز اور ان کی حسن و عشق کی دنیا:

احمد فراز کی شخصیت کے گرد ہمیشہ ایک رومانوی ہالہ رہا ہے۔ کچھ ان کی شاعری' کچھ ان کی جاذب نظر شخصیت اور کچھ ان کے عشق کے افسانے یا حقیقتیں۔ تو ان سب کے بارے میں جاننے کی کچھ نہ کچھ خواہش ہر انٹرویو لینے والے میں رہی ہے۔ شراب و شباب کے بارے میں ان سے بہت سے سوالات کیے گئے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اچھے موڈ میں ان سوالوں کے جوابات دیے ہیں۔ اس موڈ کو اور اس کیفیت کو اسی وقت محسوس کیا جا سکتا ہے کہ جب وطن اور مذھب کے حوالے سے کیے جانے والے سوالوں کا تقابلی جائزہ لیا جائے۔ ان سوالوں کے جوابات اور عشق و محبت کے حوالوں سے گفتگو کرتے ہوئے ان کے لہجے کی مٹھاس اور تلخی دونوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ حسن و عشق اور شراب و شباب کی باتیں کرتے ہوئے ان کے لہجے میں

بلا کی شوخی اور تازگی آ جاتی ہے۔ اور خاص بات یہ بھی ہے کہ کہیں کوئی معذرت خواہانہ لہجہ بھی نہیں ملتا۔

علامہ اقبال نے ہند کے شاعر و افسانہ نویس کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر سے کہا تھا کہ بیچاروں کے اعصاب پر عورت سوار ہے۔ احمد فراز نے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ "بلاشبہ ایک عمر تک ذہن پر عورت سوار رہتی ہے مگر پھر رفتہ رفتہ احساس ہونے لگتا ہے کہ عیاشی اور تعیش یا عشق و محبت اور چیزیں ہیں اور شاعری اور چیز ہے۔ اسی طرح شاعری کا شراب سے بھی کچھ تعلق نہیں ہے۔ اب یوں تو لوگوں نے شاعروں کو بلاوجہ بدنام کیا ہوا ہے۔ جس زمانے میں شراب کھلے عام ملا کرتی تھی یا ان کے کلب بنے ہوئے تھے تو وہاں ڈاکٹر، وکلا، تاجر اور دوسرے لوگ ہوا کرتے تھے اور ایک آدھ شاعر بھی نظر آ جاتا تھا۔ درحقیقت شاعری بڑی سنجیدہ چیز ہے۔ اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ آدمی اپنے پورے ہوش و حواس میں ہو اور اس کا شعور پوری طرح بیدار ہو۔ جوش کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے کبھی شراب پی کر شاعری نہیں کی۔ اسی طرح ریاض خیر آبادی نے شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں پیا جبکہ ان کی پوری شاعری میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جس میں شراب کا ذکر نہ ہو،،

شاعروں پر عشق کی تہمت کا جواب دیتے ہوئے اپنے تصورِ عشق کی وضاحت کچھ اس طرح سے کی ہے کہ "عام طور پر عشق کا الزام ہم شاعروں پر ہی عائد کیا جاتا ہے مگر صرف شاعروں کی بات نہیں میرا خیال ہے ہر انسان بلا تخصیص اس میں شامل ہے۔ انسان تو پیدائشی عاشق ہے۔ سب سے پہلے بابا آدم نے عشق کیا اور تب

سے یہ سلسلہ جاری ہے۔قیس کو دیکھیں گو وہ تو انجینیر تھا' پہاڑ توڑنے والا ایک مزدور مگر اسے لیلیٰ سے عشق نے کیا بنا دیا۔تو کیا شاعر کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ محبت کرے، عشق کرے؟

یہ جو ایک کہاوت ہے کہ OFFENCE IS THE BEST DEFENCE تو یہاں پر بھی فراز صاحب نے یہی حربہ استعمال کیا ہے بلکہ اگر ان کے انٹرویو کو غور سے پڑھیں تو واضح طور پر یہ نظر آئے گا کہ وہ اکثر و بیشتر سوال پوچھنے والے سے ہی الٹا سوال کر دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں اپنی بات زیادہ وضاحت سے کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔اب مندرجہ بالا انٹرویو ہی میں دیکھیے کہ کس خوبصورتی سے اپنے عشق کا جواز دیا ہے۔ایک اور انٹرویو میں کہتے ہیں کہ" میں کوئی یوسفِ ثانی تو ہوں نہیں کہ میرے ظاہری حسن کو دیکھ کر خواتین مرعوب ہوں اور مجھ پر فریفتہ ہو جائیں' شاعری ہی اس کی وجہ ہو تو ہو،، یعنی ایک طرح سے احمد فراز نے اپنی رومانوی شاعری کے ایک خاص دائرہ اثر کا بیان کر دیا۔یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری بالخصوص غزل کی شاعری خواتین میں بے حد مقبول ہے اور احمد فراز کو خود بھی اس کا احساس ہے۔ انہوں نے اپنے انٹرویو یا بیانات میں کبھی اس کو چھپایا بھی نہیں ہے اور شاید اسی وجہ سے ان کی شخصیت خاصی متنازعہ بھی رہی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے جو چیز جس طرح ہے اس کو اسی طرح بیان کر دیا ہے۔باقی باتیں اپنے پڑھنے والے پر چھوڑ دی ہیں۔

آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ احمد فراز کی شخصیت اور ان کے

نظریہ وفن کو سمجھنے کے لیے ان کے انٹرویو اور ان کے بیانات کو غور سے پڑھنا بے حد ضروری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے بغیر ان کی شاعری سے تو لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے کہ وہ شراب تو اپنے اندر ایک نشہ رکھتی ہی ہے مگر ان کے خیالات کو بھی اگر سامنے رکھا جائے تو پھر بقول ان کے نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

احمد فراز

فیض صاحب کے بارے میں

آج ٹورنٹو میں ۱۰ جون ۱۹۹۴ کی صبح ہے۔ کل رات احمد فراز واشنگٹن سے یہاں پہنچے ہیں۔ ایرپورٹ سے گھر آتے ہوئے فیض صاحب کا ذکر آ گیا تو میں نے سوچا کہ فیض صاحب کو جن لوگوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے یا ان سے کسی نہ کسی شکل میں متاثر رہے ہیں تو ان میں ایک نام احمد فراز کا بھی ہے۔ تو کیوں نہ اس بار ٹورنٹو کے قیام میں ان سے فیض صاحب کے حوالے سے کچھ باتیں یادگار کے طور پر ریکارڈ کر لی جائیں۔ احمد فراز کو بھی یہ آئیڈیا اچھا لگا کہنے کل صبح کہیں جانے سے پہلے ریکارڈنگ کر لیتے ہیں۔ دوسری صبح ناشتہ سے فارغ ہونے اور ایک پوری سگریٹ کے کش لینے کے بعد میں نے اپنا ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ سو یہ گفتگو اسی نشست کا ماحصل ہے۔

اشفاق: احمد فراز سب سے پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کی فیض صاحب سے

پہلی ملاقات کب اور کیسے ہوئی؟

فراز: میرا خیال ہے early fifties کا زمانہ تھا وہ ففٹی ون یا ففٹی ٹو-

اشفاق: نہیں میرے خیال میں یہ زمانہ نہیں ہوگا اس لیے کہ ففٹی ون سے ففٹی فور تک تو وہ جیل میں تھے- وہ ملاقات یا تو اس سے پہلے یا اس کے بعد ہوئی ہوگی-

فراز: ہاں شاید اس کے بعد ہی ہوئی ہوگی-تو وہ ہری پور میں ایک مشاعرہ تھا غالباً اقبال ڈے تھا- ان دنوں میرا خیال ہے اردو سبھا تھی یا حلقہء ارباب فن- بہر حال مشاعرہ ہوا وہاں کی کمیٹی ہال میں-فیض صاحب کو مدعو کیا گیا تھا-راولپنڈی سے مضطرا کبرآبادی تھے-مضطرا کبرآبادی پڑھتے بہت اچھا تھے-یا ان دنوں ہمیں بہت ہی اچھا لگتا تھا اور اس کی نظامت کر رہے تھے حفیظ اثر-تو ظاہر ہے کہ فیض صاحب کے آتے ہی ادھر ادھر ی آئی ڈی وغیرہ کے لوگ بھی جمع تھے-ہاں تو اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ وہ یقیناً ففٹی فور کے بعد ہی کا زمانہ تھا- بہر حال ہم بھی ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ میں جایا کرتے تھے- پھر جب فیض صاحب کا نام پکارا گیا تو انہوں نے غزلیں اور نظمیں سنانے سے پہلے کہا کہ چونکہ یہ اقبال ڈے کا پروگرام ہے لہٰذا اقبال کے کچھ شعروں کی تشریح کر دیتے ہیں-اور مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اس غزل کی تشریح کرنی شروع کر دی تھی- ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں-غرض یہ کہ اس غزل کی تشریح کے ساتھ ساتھ انہوں نے پوری تھیسس بیان کر دی کہ وہ کون لوگ ہیں جو دوسروں کے حقوق کو غصب کر لیتے ہیں- یہ گویا ہماری ان سے پہلی ملاقات تھی- پھر میں شاید فیض صاحب کے پاس ان سے ملنے لاہور گیا تھا جبکہ میں ''اشتیاق

''کا ایڈیٹر تھا۔ ان دنوں ریڈیو سے چھٹی ہوگئی تھی اور کوئی کام کرنے کو نہیں تھا۔

اشفاق: ''اشتیاق'' کے بارے میں کچھ بتائیں؟

فراز: ''اشتیاق'' ان دنوں پشاور سے ایک منتھلی نکلتا تھا۔ ادبی تھا اور تھوڑا بہت فلمی بھی تھا۔ بلکہ میں ہی اس کا پہلا ایڈیٹر تھا۔ تو ہم لاہور اسی لیے گئے تھے کہ وہاں سے کچھ میٹریل جمع کرلیں کیوں کہ پشاور سے رسالہ نکالنا کوئی آسان کام تو تھا نہیں۔ زیادہ تر اچھے لکھنے والے تو لاہور ہی میں تھے۔ شوکت تھانوی سے ایک مضمون لیا جس کے انہیں بیس روپے دیے۔ اوروں سے بھی مضامین لیے۔ ان دنوں ہم پے منٹ کرتے تھے۔ بلکہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ہمارا پہلا رسالہ تھا جس میں میں نے کہا تھا کہ رائٹرز کو بھی پے منٹ کرنی ہے۔ بہر حال فیض صاحب سے اسی بہانے ملنے گیا تھا۔ فیض صاحب کے نہ تو گھر کا مجھے پتا تھا اور نا ہی ان سے کوئی خاص تعارف تھا۔ تو منیر نیازی نے کہا چلو میں لے چلتا ہوں وہاں۔ تو ہم چلے گئے فیض صاحب کے پاس۔ بڑا اچھا گھر تھا ان کا اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔

اشفاق: کیا ماڈل ٹاؤن والا گھر؟

فراز: یہ لاہور کی بات ہے۔ تو یہ جو موجودہ گھر ہے یہ نہیں تھا۔ یہ تو ان کا اپنا تھا۔ اس سے پہلے وہ کسی کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ بہت اچھی طرح ملے۔ کافی وافی بھی پلوائی۔ انہوں نے ایک غزل دی اور میں نے ان کی خدمت میں وہی پیش کیا اور کہا کہ کچھ کم ہے ورنہ۔ کہنے لگے نہیں بھئی کم از کم تم لوگوں نے یہ شروع تو کیا کہ رائیٹرز کو ان کا حق دیتے ہو۔ اور انہوں نے ہمیں رسید لکھ کے دے دی۔ وہ

غزل ان کی ہمارے پرچے میں چھپی بھی- مگر اشفاق حیرت ہے کہ وہ آج تک ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہے-

اشفاق: کیا واقعی؟

فراز: ہاں' اور وہ میرے پاس بھی نہیں ہے-

اشفاق: تو کیا اشتیاق کے پرانے پرچے کہیں نہیں ہیں؟

فراز: پشاور میں ایک تو جو پرانی لائبریریاں تھیں ان کی جگہ تھانے بن گئے ہیں- کتاب کی ضرورت نہیں اور پھر پڑھنے کی فرصت کسے ہے- وہاں ہمارے دفتر کے قریب ہی ایک لائبریری ہوا کرتی تھی اس کو ہم کچھ پرچے دے دیتے تھے- باقی لائبریریاں کچھ خریدتی نہیں تھیں یا خریدتی تھی تو بس مہینے دو مہینے کے بعد ردی میں پھینک دیتے تھے- وہ سلیقہ تو ان دنوں نہیں تھا کہ ان کی فائلیں وغیرہ ترتیب دیں- بہر حال اتنا مجھے یاد ہے کہ وہ غیر مردّف غزل تھی- چھوٹی بحر میں تھی ایک شعر مجھے یاد تھا لیکن شاید ایک آدھ لفظ بھول رہا ہوں- اپنے سینے پہ رکھ کے سوتی ہے ... رات ....اور پتہ نہیں کیا تھا- تلوار' بیزار اور انتظار وغیرہ قافیے تھے- ویسے وہ ان کی اتنی اچھی غزل تھی بھی نہیں- بس وہ تو تبرک کے طور پر ہم نے لے لی تھی- اور فیض صاحب کی غزل تھی اور جو بھی ہو فیض صاحب کا تو نام ہی کافی تھا- لیکن اس غزل نے متاثر نہیں کیا ورنہ یہ کہ میں' اتنا وہ ہو گیا تھا' ایڈکٹ ہو گیا تھا فیض صاحب کی غزلوں سے کہ ان کا ایک شعر بھی سنا تو اس زمین میں غزل کہہ ڈالتا تھا- بہر حال وہ اشتیاق پرچہ تو ختم ہو گیا اور پھر اس کی جگہ خادم نکلنے لگا- پہلے جو نکالتا تھا وہ اپنی بیوی کے نام پر نکالتا تھا

اور اب کہ جو فائی نینسر تھا اس نے اپنے ہی نام کا پرچہ نکلوایا۔ اس کا نام خادم حسین کاظمی تھا۔ اسے بھی کچھ شاعری کا شوق تھا۔ تو اس نے ایک دن کہا کہ میرے لیے بھی ایک قطعہ لکھ دو۔ ہم نے لکھ دیا تو وہ اس کے نام سے چھپ گیا۔ اب وہ کہنے لگا کہ ہر مہینے لکھ دیا کرو اور میں تمہیں دس روپے اور دوں گا۔ تنخواہ تو ہماری سو ڈیڑھ سو روپے تھی۔ ہم نے دھڑا دھڑ قطعہ لکھنا شروع کر دیا۔ اس سے ہمارا جیب خرچ نکل آیا کرتا تھا۔

اشفاق: اچھا ہم اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں اور آپ یہ بتائیں کہ فیض صاحب سے تو آپ کی ملاقات جیل سے رہا ہونے کے بعد ہوئی تھی تو کیا آپ نے یہ محسوس کیا تھا کہ جیل جانے کی وجہ سے ان کو راتوں رات شہرت مل گئی ہے؟

فراز: میں ایک بات کہوں اشفاق کہ میں فیض صاحب کو جیل جانے سے پہلے نہیں جانتا تھا اور نا ہی میں ان کی شاعری سے متاثر تھا اور نا ہی میرے خیال میں اس وقت تک ان کی کوئی کتاب پڑھی تھی۔ راشد کی ماورا تو میں نے دیکھی تھی لیکن فیض صاحب کی نقش فریادی میں نے نہیں دیکھی تھی اور جب پہلی بار ہری پور کے مشاعرے میں ان کو سنا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ مشاعرہ ہے یہاں پر آخر اقبال کے شعروں کی تشریح کی کیا ضرورت ہے۔ بہرحال وہ اقبال ڈے کا مشاعرہ تھا تو یہ باتیں بعد میں سمجھ میں آئیں کہ یہ کیوں ضروری تھا۔ کافی سی آئی ڈی کے لوگ بھی وہاں تھے۔

تنہا تنہا کے چھپنے سے پہلے میں نے ان سے اس پر کچھ لکھنے کو کہا تھا تو انہوں نے بڑی محبت سے کہا کہ ہاں بھئی۔ تو میں نے کچھ چیزیں جو تھیں وہ ان کو بھیج دیں۔ وہ مصروف بہت رہتے تھے حالانکہ پتہ نہیں کیسے مصروف تھے وہ۔ شاید ایڈیٹر تو

نہیں تھے لیکن پاکستان ٹائمز جاتے تھے اور وہاں میاں افتخار الدین اُن سے ایڈیٹوریل وغیرہ لکھوالیا کرتے تھے- ایلس کے کہنے کے مطابق تو بخاری کے بعد اگر کوئی اچھی انگریزی لکھتا تھا تو وہ فیض تھے- خود ہی کہتی ہیں کہ اس لیے نہیں کہ He is my husband بلکہ یہ میری Honest Opinion ہے- اور اردو کے بارے میں ایک مرتبہ سبط حسن مجھ سے کہنے لگے کہ وہ کافر نظم تو نظم' نثر بھی بڑی خوب صورت لکھتا ہے- ظالم کا لفظ تو انہوں نے اس طرح استعمال کیا کہ بس-

اشفاق: مگر انہوں نے نثر کو شاید اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا؟

فراز: نہیں' جو کچھ انہوں نے- خیر میں تو زیادہ فیض صاحب کے اتنے قریب نہیں رہا جتنے سبط صاحب تھے- اور جن دنوں وہ لیل ونہار کے ایڈیٹر تھے اور فیض صاحب بھی ساتھ تھے تو وہ ان سے لکھواتے تھے- دوسری بات یہ کہ فیض کا ایک مضمون میں نے لندن میں جب انہوں نے پڑھا- تو میں نے پہلی مرتبہ ان کا لکھا ہوا مضمون ان کی اپنی زبان سے سنا- وہ تھا فیض صاحب کی سارے سخن ہمارے کی تعارفی تقریب میں- تو اس میں یہ تھا کہ ایک آدھ نظم کی انہوں نے شان نزول بھی بتائی تھی- بڑا خوب صورت مضمون تھا وہ- بلکہ بڑا قیمتی تھا- میں نے اس کے بعد فیض صاحب سے کہا تھا' جب ہم آئے واپس گھر میں' کہ فیض صاحب اتنا اچھا مضمون تھا آپ کا تو اگر آپ اس طرح اپنی بیس پچیس نظموں کے بارے میں لکھ دیں تو یہ نثر و ادب کے طالب علموں کے لیے بہتر ثابت ہوگا- بلکہ critics جو ہیں آپ کے یا وہ جو آپ سے محبت کرنے والے ہیں' یا آپ کے مداح جو ہیں تو ان سب کے یہاں

ایک تجسس تو ہوتا ہے کہ شاعر نے کیسے لکھا' کیا وجہ تھی اس کی وغیرہ تو ان کا جواب وہی تھا کہ ہاں بھئی لکھیں گے کبھی۔

اشفاق: ان کی بہت سی نظموں کے پس منظر تو سب ہی کو معلوم ہیں جیسے یہ داغ داغ اجالا یا ایرانی طلبا کے نام' یا مشرقی پاکستان کے حوالے سے تو آپ ان کی کسی خاص نظم کا پس منظر بتانا چاہیں گے؟

فراز: ہاں وہی نظم جو تھی ان کی "لہو" - کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ - تو وہ ہوا یوں کہ انہوں نے پہلی مرتبہ پشاور میں یہ نظم پڑھی - ان دنوں ایوب خان اور فاطمہ جناح کا الیکشن تھا - اور فاطمہ جناح کے حامیوں پر گوہر ایوب کے حامیوں نے فائرنگ کی تھی اور اس میں تین چار یا کتنے لوگ مر گئے تھے - کیونکہ جس ٹرک پر گوہر ایوب تھا وہاں اس کے ساتھ ایوب خان کے حامی بھی تھے - اور یہ جلوس تھا کراچی میں - ظاہر ہے کہ کراچی تو اپوزیشن کا گڑھ تھا' فاطمہ جناح کے حامی ویسے تو ملک بھر میں تھے مگر کراچی تو خاص طور سے اس کا مرکز تھا - تو وہاں پر گوہر ایوب نے گولی چلوائی تھی - اس پر بہت ہنگامہ ہوا تھا - بعد میں جیسا کہ ہوتا ہے تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیا گیا - اور اس کے بعد بات آئی گئی ہوگئی - تو خیر فیض صاحب لاہور سے آ رہے تھے یا کراچی سے بہر حال میں انہیں ایر پورٹ لینے گیا تھا اور بھی کچھ لوگ ساتھ تھے - تو شام کو جب مشاعرہ ہوا تو انہوں نے وہ تازہ نظم سنائی کہ یہ خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا - ان کا حافظہ کمال کا تھا -

آپ نے ابھی خود ہی کچھ نظموں کے پس منظر کے بارے میں پوچھا تھا

تو اس میں ایک اور اضافہ کرلیں وہ بیروت کے زمانے کی نظمیں ہیں۔ بیروت سے جب وہ لندن آئے تھے تو میری کتاب کی تقریب رونمائی تھی۔ انہوں نے صدارت کی تھی۔ وہ بڑے ماڈریٹ اور جنرلیس تھے۔ جب لوگ مجھ سے سن چکے تو فیض صاحب سے بھی کچھ سنانے کو کہا گیا تو کہنے لگے کہ فراز کے بعد شعر سنانے کی گنجائش تو کم رہتی ہے۔ تو پھر انہوں نے شوپیں کا نغمہ بجتا ہے والی نظم سنائی تھی۔

اشفاق: فیض صاحب کے یہاں اور پھر خود آپ کے یہاں بھی ایک کلاسیکی ڈکشن پایا جاتا ہے۔ اس ڈکشن سے قربت کی بنیادی وجہ کیا ہے؟

فراز: بات یہ ہے کہ فیض صاحب نے کلاسیکی شاعری کو صرف پڑھا ہی نہیں بلکہ وہ ساری پرانی اصطلاحیں جو تھیں ان کو استعمال کیا اور ان کو نئے معنی دیے۔ اب دیکھیے کہ بہت پرانا شعر ہے اور کسی سیاسی حوالے کا نہیں ہے لیکن فیض صاحب نے اس کو بالکل سیاسی perspective میں دیکھا اور اپنی غزل کا جز بنالیا۔ وہ ہے نا کہ:

کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی۔

اچھا اسی طرح سودا سے وہ بہت متاثر تھے۔ اور صبا جو ان کا ایک خاص سمبل تھا' اور اپنی کتاب کا نام بھی انہوں نے دست صبا رکھا تو یہ بھی انہوں نے پرانے شاعروں سے لیے۔ خاص طور پر وہ سودا سے بڑے متاثر تھے۔

اشفاق: مگر ان کی شخصیت میں جو دھیما پن تھا تو اس کے حساب سے انہیں تو میر سے زیادہ متاثر ہونا چاہیے تھا۔

فراز: ہاں' ہونا تو چاہیے تھا لیکن وہ میر سے اتنے متاثر نہیں تھے جتنے کہ سودا

سے تھے۔ جب بھی بات ہوئی تو سودا کی بڑی تعریف کی۔ اصل میں وہ کہتے تھے کہ سودا
میں بڑی زندگی تھی' اس کی شاعری میں بھی زندگی تھی' وہ مار کھا کے ایک کونے میں بیٹھ
جانے والا آدمی نہیں تھا بلکہ وہ لڑنے والا آدمی تھا۔ وہ سودا کی بہت تعریف کرتے
تھے۔ خاص طور پر سودا کا جو فوکس تھا وہ اپنی ذات سے زیادہ اپنے اردگرد کے ماحول
سے تھا۔ اور خاص طور پر سودا کا جو "شہر آشوب" تھا تو وہ تو ایک بالکل ہی نیا باب
تھا۔ اس میں اپنی ذات کے علاوہ اپنی دنیا کے اردگرد کے لوگوں کی باتیں تھیں۔ وہ
جس کے خلاف ہوتا تھا تو اپنا قلم سنبھال کے بیٹھ جاتا تھا۔ تو میرے خیال میں سودا کی
یہ خوبی فیض صاحب کو پسند آئی ہوگی۔ فیض صاحب کے یہاں اسی لیے باوجود دھیمے
پن کے میر کی جیسی آہ و بکا نہیں ہے۔ وہ خاک ہونا نہیں بلکہ خاک سے شرارے لے کر
اٹھنے والے لوگوں میں سے تھے۔ اور یہ جو زندہ دلی کہیں اسے یا زندگی سے محبت کہیں
اسے' یا رجائیت کہیں یا امید کہیں اسے تو یہ فیض صاحب کے یہاں بھرپور تھی۔ وہ جو
ہے نا ان کی غزل' جو جیل میں لکھی تھی کہوں یا نا کہوں تو اس میں یہی نہیں ہے کہ سودا کی
زمین میں غزل کہی ہے بلکہ اس غزل کا مزاج بھی ویسا ہی ہے۔ فیض صاحب نے ان
کلاسیکی شاعروں کو جیل میں خاص طور سے پڑھا۔

اشفاق: مگر جس زندگی کا حسن انہیں سودا کے یہاں نظر آیا تھا وہ تو غالب کے
یہاں بھی ان کو ضرور نظر آیا ہوگا؟

فراز: بھئی غالب سے تو وہ بہت ہی متاثر تھے غالب کی تو بات ہی الگ
ہے۔ دست تہِ سنگ' نقشِ فریادی' نسخہ ہائے وفا یہ سب نام غالب ہی سے تو لیے ہیں۔

اشفاق: مگر میں پوچھنا چاہوں گا کہ جب لندن سے ان کا کلیات چھپا تو اس کا نام "سارے سارے سخن ہمارے" تھا جبکہ پاکستان سے ان کا کلیات نسخہ ہائے وفا کے نام سے شائع ہوا ہے۔تو ایسا کیوں ہوا؟

فراز: اس نام پر تو میں نے ان کو بڑا وہ کہا کہ نسخہ ہائے وفا کوئی حکیموں کی دکان آپ کرنے جا رہے ہیں۔ یہ بات میں نے محفل میں کہی تھی۔ آپ ان لوگوں سے پوچھ لیں جو وہاں تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کا نام "سارے سخن ہمارے" رکھیں۔ یہ آپ کے مزاج کی لائین ہے۔ آپ کی غزل بھی ہے۔ ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے۔ ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے۔ استعارے تھے 'سہارے تھے وغیرہ۔ وہاں شاہد حسین بھی تھے' ان کی بیگم یاسمین بھی تھیں۔ کوئی دو چار لوگ اور بھی تھے۔ تو ان سب نے کہا فراز ٹھیک کہتے ہیں' یہ نام زیادہ پیارا ہے۔ تو فیض صاحب نے بھی کہا کہ بھئی چلیں یہی نام رکھ لیں۔ چنانچہ ان کا اصل کلیات لندن سے سارے سخن ہمارے ہی کے نام سے شائع ہوا تھا مگر انہوں نے وہ ضد چھوڑی نہیں۔ پاکستان میں وہ نسخہ ہائے وفا کے نام ہی سے چھپوایا۔

جن کو وہ عزیز رکھتے تھے تو وہ لوگ اگر ضد کریں تو بعض اوقات مان بھی جاتے تھے اور بعض اوقات نہیں بھی۔ مثلاً یہ کہ اگر انہیں کہیں جانا ہے اور آپ نے کہہ دیا کہ نہیں جی چھوڑیں۔ تو وہ بہت نرمی مگر استقامت کے ساتھ کہتے تھے کہ نہیں بھئی وہاں تو جانا ہے۔ Polite and firm تھے وہ اپنے ارادوں میں۔ دوسرے یہ کہ وہ بہت Clear headed تھے۔ کسی موضوع پر خاص طور پر جب ہم Exile

میں تھے تو زیادہ موقعہ ملتا تھا چاہے وہ سیاست ہو یا ادب' گفتگو بہت سیدھی اور سلجھی ہوئی کرتے تھے-ان کے یہاں بہت مکمل ابلاغ تھا-وہ اپنی بات بڑی آسانی سے دوسروں تک پہنچا دیتے تھے-بعض باتیں تو عجیب تھیں-مثلاً گورمانی تھے' مشتاق احمد گورمانی تو' تھے تو وہ ان کے بالکل مخالفین میں لیکن فیض صاحب کہتے تھے رات کو ان کے سرہانے نقش فریادی ہوتی تھی-پھر انہوں نے جب اپنی پارٹی بنائی تو فیض صاحب کہنے لگے اس کا منشور ہم نے بنایا تھا-جب ہم نے کہا کہ یہ کیا بات ہوئی تو کہنے لگے کہ بھئی ہم نے منشور میں کوئی ان کی بات تھوڑی کی تھی' باتیں تو اس میں ہماری ہی تھیں-تو یہ بڑے شفاف دماغ کی باتیں تھیں-

خود مجھے جب نیشنل سنٹر کی ملازمت کی آفر ملی تو میں ڈبل مائنڈ ڈ تھا کہ جاؤں یا نا جاؤں-یونیورسٹی کی نوکری چھوڑ کر سرکاری نوکری کرنا عجیب سا لگتا تھا-اکثر باتوں میں فیض صاحب نے ہمیں مشورہ دیا اور بالکل ٹھیک ہی دیا-تو مجھ سے کہنے لگے کہ ارے بھئی جاؤ-کیوں نہیں جاؤ-میں نے کہا سرکاری نوکری ہے-کہنے لگے بھئی ہم تو چاہتے ہیں کہ سی آئی ڈی میں بھی ہمارے آدمی ہوں' امامِ مسجد بھی ہمارا ہو' اگر تم نہیں جاؤ گے تو کوئی جماعت اسلامی والا آ جائے گا یا کوئی اور گڑبڑ قسم کا آدمی آ جائے گا-پھر ایک زمانے میں ہمارا چل رہا تھا کچھ چکر' لاہور کی ایک مشہور گلوکارہ سے تو ہم نے فیض صاحب سے مشورہ مانگا کہ ہم اس سے شادی کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں-تو کہنے لگے بھئی یہ کام نہیں کرنا-میں نے کہا کیوں جی کیوں نہیں کرنا؟ تو کہنے لگے کہ They are very expensive people.

انہیں فلاں جگہ بھی جانا ہے' مری بھی جانا ہے' لندن بھی جانا ہے- اور تم اور ہم جیسے لوگ یہ چیزیں افورڈ نہیں کر سکتے -وہ بالکل ناصح بن گئے مگر اسلام آباد میں میری ایک جرمن دوست تھی- ایک دوبار فیض صاحب کے ساتھ بھی اس سے ملاقات ہوئی -خود ہی مشورہ دیا کہ بھئی لڑکی اچھی ہے' تمہارا اتنا خیال رکھتی ہے اور تمہارے دوستوں کا بھی تمہاری وجہ سے بہت خیال رکھتی ہے تو میں تو یہ کہوں گا کہ اگر شادی کرنی ہے تو اس سے کرلو-

اشفاق: اچھا یہ خوب بات ہوئی ایک لڑکی کے بارے میں تو کہا کہ اس سے شادی نہ کرو اور دوسری لڑکی کے بارے میں خود ہی مشورہ دیا کہ اس سے شادی کرلو-

فراز: اصل میں وہ بندے کو پرکھ لیتے تھے- اور ایک بات میں ان کے بارے میں ضرور کہنا چاہوں گا کہ وہ اپنے آپ کو پروجیکٹ نہیں کرتے تھے- modest تھے- میری اسی جرمن دوست کے یہاں ڈائننگ ٹیبل پر ایک ٹیبل کلاتھ بچھا ہوا تھا اور جو کوئی بھی اس کے یہاں آتا وہ اس سے کچھ نہ کچھ لکھوا لیتی تھی یا سائن کروا لیتی تھی اور بعد میں اسے کاڑھ لیتی تھی- جب فیض صاحب آئے تو اس نے کہا کہ آپ اس پر کوئی شعر لکھ دیں- تو انہوں نے اپنا نہیں بلکہ حافظ کا شعر لکھا-

اشفاق: ہاں اور وہ جو ان کی لینن امن انعام لیتے ہوئے تقریر ہے اس میں بھی انہوں نے حافظ ہی کا شعر پڑھا تھا- خلل پذیر بود والا-

فراز: ہاں بالکل صحیح ہے- اور دیکھیں نا ابھی جو بات ہو رہی تھی ان کی نثر کی تو کیا ماسٹر پیس تقریر تھی وہ- اتنی خوب صورت اور لاجواب نثر-

اشفاق: جہاں تک ہم لوگ جانتے ہیں فیض صاحب loose talk کرنے والے آدمی بالکل نہیں تھے۔ آپ ان کے بہت قریب رہے ہیں کیا کبھی آپ نے بہت ہی قریبی دوستوں کی محفل میں انہیں لوز ٹاک کرتے ہوئے سنا ہے؟

فراز: No, not at all بعض چیزیں تو ایسی ہیں کہ لندن میں ہم لوگ کافی عرصے تک ایک ہی چھت کے نیچے رہے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے کوئی ہزل و زل کا شعر سنایا ہو' کوئی لوز ٹاک کی ہو یا کسی کی برائی کی ہو۔ بالکل نہیں۔ ان کے مخالفین بھی جو نہ جانے کیا کیا ان کے بارے میں کہتے رہتے تھے ان کے بارے میں بھی اگر کسی نے کبھی کوئی ذکر چھیڑا تو یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے تھے کہ بھئی وہ بھی ٹھیک ہے' ان کا بھی تو دھندہ چلتے رہنا چاہیے۔

ایک دفعہ بی بی سی پر انٹرویو کے دوران ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کوئی ایسی بات بتانا پسند کریں گے جو اب تک آپ نے نہ بتائی ہو۔ تو کہنے لگے بھئی ہم کیوں آپ سے کہیں کہ حفیظ جالندھری بھی ہزل کہتے تھے۔ بس اتنا انہوں نے کہا۔

اشفاق: جی ہاں ایک بار اردو انٹرنیشنل کے لیے انہوں نے ۱۹۸۲ء میں گزر جانے والے ادیبوں کے بارے میں ایک مختصر سا مضمون میری فرمائش پر بھیجا تھا تو اس میں بھی جوش صاحب کے انتقال پر حفیظ جالندھری کے بیان پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ نہ جانے کیوں وہ آخری عمر میں مردم بیزاری اور دوستوں کی دل آزاری کرنے لگے تھے۔

فراز: اور یہ بھی دیکھیے کہ انہوں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہا' جوش

صاحب کے انتقال کے وقت جو حفیظ جالندھری نے بیان دیا تھا اس پر کہا تھا- حالانکہ حفیظ جالندھری نے ان کے لیے کیا کیا نہیں کہا تھا-

اشفاق: آپ نے کہا ہے کہ اکثر آپ نے فیض صاحب سے مشورہ لیا ہے تو کیا جلاوطنی کے بارے میں بھی کبھی بات ہوئی؟

فراز: ہاں ایک بار اس موضوع پر بات ہوئی تھی وہ ان دنوں بیروت میں تھے اور کہیں جاتے ہوئے کراچی میں ان کا ٹرانزٹ تھا- تو انہوں نے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ دیکھو فراز دو کام کرو- اگر تم باہر جا سکتے ہو کسی طرح' تو باہر نکل جاؤ- اور اگر یہ نہیں کر سکتے تو اپنے گاؤں کوہاٹ چلے جاؤ- اور وہاں دو تین سال بالکل خاموشی کی زندگی گزار دو- تو کوہاٹ تو میرا جانا ممکن نہیں تھا وہ بھی اتنے عرصے کے لیے- تو باہر جانے کا جو آپشن تھا تو اس کے بارے میں میں نے کہا کہ دیکھیں گے اگر کوئی صورت پیدا ہو گئی- لیکن باہر جا کے بھی کیا کروں گا- اچھا' تو جب میں جانے لگا تو اتنا اداس تھا کہ فیض صاحب نے میرے ماتھے پر بوسہ دیا- بالکل جیسے کوئی اپنے چھوٹے کو پیار کرے-

اسی دوران ۱۹۸۲ء کے دنوں میں' میں کراچی آیا تو مجھے کراچی بدر کر دیا گیا- تو پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے کسی بھی طرح سے باہر ہی جانا چاہیے- پھر ان دنوں بلو اور علی محمود سے ہماری دوستی تھی تو انہوں نے مشتاق گزدر کی اقبال کے بارے میں بنائی ہوئی فلم دکھلائی جس میں کچھ فیض صاحب کا بھی حصہ تھا- تو میں نے کہا کیوں نہ فیض صاحب کے بارے میں بھی فلم بنائی جائے- تو یہ آئیڈیا انہیں ا

لگا مگر انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس کا اسکرپٹ لکھنا تمہیں ہوگا جس کا میں نے وعدہ کرلیا- اور طے یہ کیا گیا کہ اسکرپٹ میرا ہوگا' ڈائرکشن گزدر کی ہوگی اور فائی نینسنگ علی محمود اور بلو وغیرہ خود کریں گے یا کروادیں گے- علی نے کہا کہ میں بیروت جا کر خود فیض صاحب سے بھی بات کرلوں گا- علی محمود شوکت ہارون کے بیٹے ہیں اور شوکت فیض صاحب کے بہت قریب تھیں اور وہ ان کو بہت عزیز رکھتے تھے- میرا خیال ہے کہ بہت پرانی دوستی تھی ان سے کیوں کہ خود علی نے بھی براہ راست مجھ سے اس کی تصدیق کی تھی- علی نے کہا کہ ایک بار میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ فیض صاحب بہت ہی اچھے آدمی ہیں اور میں تمہیں ان سے ملواتی ہوں آج شام کو- علی بہت چھوٹا تھا ان دنوں- وہ ان کے گھر ٹھہرتے بھی تھے- علی نے ان سے کہا کہ میرے لیے انگریزی میں کوئی نظم لکھ دیں میں اسے اسکول میں سناؤں گا- جو انہوں نے لکھ دی اور علی نے اسے اپنے اسکول میں پڑھ دی اور اس کی بہت واہ واہ ہوئی- اس نے کہا کہ میں بھی ایک نظم لکھ دوں گا اور دو تین دن بعد علی نے بھی ایک نظم لکھ دی جس پر بقول علی' فیض صاحب نے کہا یہ کیا بکواس لکھی ہے- مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ پشاور میں میرے ساتھ تھے یا شاید اسلام آباد میں تھے- مگر تھے ہمارے ساتھ تو انہیں کوئی فون آیا جس کو سن کر وہ بہت ہی اپ سٹ ہو گئے تھے- کہنے لگے مجھے فوراً کراچی جانا ہے- شوکت کا انتقال ہو گیا ہے- میں نے اس وقت انہیں بہت ہی اداس' بہت ہی مغموم اور بہت ہی تکلیف میں دیکھا تھا- صرف ان کی آنکھ میں آنسو نہیں تھے مگر غم کی کیفیت بہت تھی- اور پھر وہ فوراً کراچی چلے گئے تھے-

اشفاق: اچھا تو وہ فلم والی بات کی طرف واپس آتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہوا؟

فراز: میں نے سوچا بیروت جا کے فیض صاحب سے خود بات کرلوں۔ بیروت کے ویزے کے لیے اپلائی کیا۔ ویزا تو مل گیا مگر معلوم ہوا کہ بیروت میں تو اتنی شدید بمباری ہو رہی ہے کہ وہاں جایا ہی نہیں جا سکتا۔ فیض صاحب سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی نہ ہو سکی۔ پھر ہم نے سوچا چلو لندن ہی چلے جاتے ہیں وہیں رہ کر فیض صاحب سے بات ہو سکتی ہے۔ پھر میں اسلام آباد سے کراچی آیا اور وہاں سے بلّو وغیرہ کے ہمراہ لندن آ گیا۔ بلّو کا بہت بڑا گھر تھا لندن میں وہیں ٹھہرا ہوا تھا اور ایک دن لندن کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ میں کسی فنکشن سے ہم لوگ واپس آئے۔ شاید ہمارے ساتھ نارنگ صاحب بھی تھے۔ اتنے میں دیکھا کہ فیض صاحب مع سامان کے وہاں آ گئے۔ اس طرح لندن میں ہم ان کے ساتھ ہی کچھ دنوں تک رہے۔ وہیں ان سے اس ڈاکومینٹری کے بارے میں بات چیت ہوئی تھی۔ میں صبح سویرے اٹھ کر چائے وائے پی لیتا تھا مگر فیض صاحب نو ساڑھے نو بجے تیار ہو کر نیچے آتے تھے۔ باقاعدہ سوٹ ووٹ پہن کر اور ٹائی لگا کر نیچے آتے تھے۔ ایسا نہیں کہ گاؤن وغیرہ پہنا ہوا ہو۔ ناشتہ واشتہ کرنے کے بعد وہ سگریٹ سلگاتے تھے اور پھر میں ان کے ساتھ بیٹھ کر اسکرپٹ کے لیے میٹر اکٹھا کرتا۔ بلّو نے ایک ویڈیو کیمرہ بھی اسی کام کے لیے لے لیا تھا۔ ہم لوگ باتیں کرتے رہتے اور وہ کیمرہ چلاتی رہتی۔ وہ فلم ان کے پاس ضرور موجود ہو گی ابھی تک۔ پھر کچھ دنوں کے بعد وہاں سے ہمیں

ایمسٹرڈم جانا پڑا تھا - ہم لوگ ساتھ ہی تھے - میں تو اسد مفتی کے ساتھ ٹھہر گیا لیکن فیض صاحب ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے - خیر وہ ایک علاحدہ اپی سوڈ ہے بعد میں پتہ چلا کہ ان کی کوئی دوست وہاں آ گئی تھیں - تو ہم لوگ وہاں کچھ دن رہے - پھر لندن سے افتخار کا فون آ گیا کہ کینیڈا والے ہمیں بلوانا چاہتے ہیں - پھر فیض صاحب اور ہم سب لوگ یہاں آپ کے شہر میں آ گئے - پھر یہاں کینیڈا سے ہم امریکہ چلے گئے اور فیض صاحب یہاں سے ویت نام چلے گئے - اس طرح کام چلتا رہا - وہاں سے جب وہ واپس آئے تو ماسکو چلے گئے - علاج کے لیے سینی ٹوریم میں داخل کر لیا گیا تھا - وہاں سے جب لندن واپس آئے تو سگریٹ وگریٹ چھوڑ رکھا تھا انہوں نے - وہسکی بھی چھٹ گئی تھی بلکہ چھڑوا دی گئی تھی - ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ وہ پھر بیمار پڑ گئے اور کراموول اسپتال میں داخل ہو گئے - ہم نے کہا ابھی تو آپ مرمت کروا کے ماسکو سے آئے تھے - کہنے لگے ہاں دوستوں نے کہا کہ ڈبل چیک اپ کروا لیں تو ہم نے سوچا شاید یہ لوگ سگریٹ اور وہسکی کی اجازت دے دیں - وہ جو غالب نے کہا تھا نا کہ: کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب ☆ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی - تو وہ والا معاملہ تھا -

اشفاق: اچھا تو فلم کے حوالے سے ایک بات پوچھنی رہ گئی تھی - اور وہ یہ کہ جب لندن میں پہلی بار آپ نے ان سے فلم بنانے کا ذکر کیا تو ان کا ردِ عمل کیا تھا -

فراز: انہوں نے کوئی خاص تاثر نہیں دیا تھا بس یہ کہا کہ ہاں بھئی وہ سلیمہ بھی کچھ ایسا ہی چاہتی ہے - تو میں نے کہا کہ دیکھیے بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ہم آپ

گفتگو کر سکتے ہیں' کئی ایسے کونے کھدرے ہوتے ہیں جو آدمی بہت ہی قریبی دوستوں سے شیئر کر سکتا ہے۔ انہوں نے کہا نہیں بھئی یہ بات نہیں ہے وہ جو ہماری بیٹی ہے اس سے ہماری بہت بے تکلفی ہے تو ایسی کوئی چھپانے کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ کہ وہ ہمارے ساتھ بھی مکمل طور سے شامل رہے۔ خود چونکہ انہوں نے ایک دو فلمیں بنائی تھیں تو ان کے مشورے بھی تھے۔

اشفاق: پھر فلم کا کیا بنا؟

فراز: بس ہم میٹر وغیرہ ہی اکٹھا کر رہے تھے کبھی ان کا ادھر ادھر جانا ہوا تو کبھی ہم ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہے۔ پھر وہ پاکستان چلے گئے اور ہم ادھر ہی رہے۔ اور پھر ان کے انتقال کی خبر مجھے یہیں امریکہ میں ملی تھی۔

اشفاق: مگر وہ جو اسکرپٹ تھا اور وہ جو وڈیو وغیرہ بنی تھیں تو وہ کہاں گئیں؟

فراز: میرے خیال سے بلو کے پاس ہونی چاہییں۔ شاید کچھ سلیمہ اور ایلس خود آ کر لندن سے لے گئیں یا شاید ابھی تک ان کے پاس ہوں۔

اشفاق: پھر بھی اسکرپٹ کا کیا خاکہ آپ کے ذہن میں تھا؟

فراز: آؤٹ لائین اس کی کچھ یوں تھی جس میں میں دکھاتا کہ بمباری وغیرہ ہو رہی ہے اور پھر وہ جو بیروت میں لوٹس کا دفتر تھا اس کا آدھا حصہ بمباری سے ٹوٹا ہوا ہے۔ اور وہاں ایک ستر بہتر سال کا بوڑھا آدمی اپنے وطن سے دور اس کی یاد میں اپنی نظم سناتا ہے۔ وہی والی جو ہے نا کہ وہ آ گئے میرے ملنے والے۔ اور اس میں جو لائین ہے خیال سوئے وطن رواں ہے۔ سمندروں کی عیاں تھامے۔ تو اس سمندر

کے کنارے سے پیچھے کی طرف جاتے - سیالکوٹ میں ان کے آبائی گھر - اور پھر ان کا اسکول اور کالج اور پھر یونیورسٹی کے مشاعرے وغیرہ کھلاتے - غرض یہ کہ جیسے جیسے ان کی زندگی کا سفر ہوتا وہ ہم دکھاتے - یہی کچھ خاکہ تھا اس کا -

اشفاق: یہ تو بہت برا ہوا کہ جس کام کا خیال لے کر آپ پاکستان سے چلے تھے اس کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے -

فراز: ہاں میں نے ایک آدھ بار سوچا بھی بعد میں لیکن وہ پروجیکٹ ادھورا ہی رہ گیا -

اشفاق: کیا اس کا ایک سبب فیض صاحب کے گرد لندن میں ان کے چاہنے والوں کا مجمع بھی تھا؟

فراز: ہاں ان کے پاس تو لوگ ہر وقت آتے ہی رہتے تھے - اور وہ سب سے ملتے تھے - کسی کو بھی منع نہیں کرتے تھے -

اشفاق: کیا کبھی اس کے برعکس بھی کسی موقعے پر ہوا ہے؟

فراز: وہ سب سے بڑی محبت کے ساتھ ملتے تھے - ہاں یاد آیا ایک مرتبہ شام کا وقت تھا - بلو اور ایلس کہیں گئے ہوئے تھے - ہم لوگ ڈرنک کر رہے تھے - اتنے میں فون آیا - ساقی فاروق تھا فون پر - اس نے کہا میرے گھر آجاؤ 'یہاں پر شراب کی کوئی پرابلم نہیں ہوگی - میں نے کہا جہاں میں ہوں وہاں بھی کوئی ایسی پرابلم نہیں ہے بلکہ جو شراب ہم پی رہے ہیں وہ تمہارے پاس یقیناً نہیں ہوگی - کہنے لگا کون سی - تو جب میں نے شراب کا نام بتایا تو کہنے لگا ہاں وہ تو میرے پاس نہیں ہے - پھر میں

نے کہا اور جو کمپنی میرے پاس ہے وہ بھی تم نہیں دے سکتے تو میں تمہارے پاس کیوں آؤں؟ کہنے لگا اچھا تو تم فیض کے ساتھ ہو تو چلو میں بھی وہیں آ جاتا ہوں۔ میں نے کہا ٹھہرو پہلے میں پوچھ لوں کہ ان کا کیا پروگرام ہے۔ میں نے فون پر ہاتھ رکھتے ہوئے فیض صاحب سے کہا کہ ساقی ہے اور آنا چاہتا ہے۔ تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا نہیں اسے نہیں بلانا۔ تو میں نے ساقی سے کہا کہ فیض صاحب تھکے ہوئے ہیں اور وہ تھوڑی دیر بعد سونے جانے والے ہیں' لہٰذا ابھی نہ آؤ۔ تو وہ کہنے لگا اچھا پھر کبھی سہی۔ مگر منع کرنے کے باوجود پندرہ بیس منٹ میں وہ مع اپنی بیوی کے وہاں آ گیا۔ جب آ ہی گیا تو پھر فیض صاحب...... خیر چھوڑیں اس بات کو۔

اشفاق: فراز آپ بھی ایگزائیل میں تھے اور فیض صاحب بھی تو آپ دونوں کے رویوں میں کیا کوئی واضح فرق تھا اس حوالے سے؟

فراز: ہاں کچھ فرق تو تھا بہر حال۔ وہ آخری دنوں میں کچھ کمزور سے پڑ گئے تھے بعض باتوں میں۔ ایک مرتبہ وہیں لندن میں انہوں نے کہا کہ بھئی افرو ایشین رائٹرز کو دوبارہ سے activate کرنا چاہیے۔ ان دنوں عبداللہ ملک بھی آئے ہوئے تھے۔ اور کچھ دو چار اور دوست جمع ہو گئے تھے تو کوئی پندرہ بیس لوگوں کی گیدرنگ ہو گئی تھی۔ جب اس میٹنگ میں بات ہوئی کہ کوئی ریزولیشن تیار کرتے ہیں تو میں نے کہا اپنے ملک پاکستان میں ہیومن رائٹس اور فریڈم آف ایکسپریشن کی بھی اس میں بات ہونی چاہیے۔ تو فیض صاحب نے کہا کہ نہیں بھئی نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ تو میں نے کہا کہ جی اگر ہم اپنے وطن کے بارے میں بات نہیں کر سکتے تو ہمیں ایشیا سے کیا اور

افریقہ سے کیا؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم اپنے گھر کی بات کریں پھر کہیں اور کی solidarity کی بات کریں۔ فیض صاحب نے کہا نہیں نہیں یہ نہیں ہوگا اس میٹنگ میں۔ تو میں نے کہا یہ نہیں ہوگا اس میٹنگ میں تو میں واک آؤٹ کرتا ہوں۔ میں اس میں نہیں ہوں۔ فارغ بخاری بھی تھے انہوں نے کہا فیض صاحب یہ تو نہیں ہو سکتا۔ تو ہم دونوں وہاں سے اٹھنے لگے۔ میرے اندر ان دنوں کچھ زیادہ ہی غصہ تھا لہٰذا میں کچھ زیادہ ہی vocal ہو گیا تھا۔ اجلاس سے باہر نکلے تو فیض صاحب نے میری گردن میں بازو ڈالے' حالانکہ ایسا وہ بھی اور کسی کے ساتھ نہیں کرتے تھے وہ اپنے آپ کو بہت لیے دیے رہتے تھے' اور کہا نہیں بھئی بات یہ ہے نا کہ ابھی ہمیں واپس بھی جانا ہے۔ تو آخری دنوں میں اس پر controversy بھی چلی۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہوں گا کہ آخری دنوں میں وہ کچھ تھک سے گئے تھے اور وہ چیزوں کے معاملے میں محتاط بھی ہو گئے تھے۔ مثال کے طور پر پہلے تو میں نے ذکر نہیں کیا اس کا لیکن اب چونکہ بات چل پڑی ہے تو کہتا ہوں کہ جب ہم ایمسٹرڈم گئے تو وہاں کچھ لڑکے تھے' سوشلسٹ نظریات تھے ان کے' جو کوڑے وڑے کھا کے کسی طرح بھاگ کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے وہاں اپنا چھوٹا سا دفتر بنایا ہوا تھا جس میں وہ شام کو سوشلزم پر لیکچر وغیرہ کا اہتمام کیا کرتے تھے اور اسی قسم کی باتیں وہاں ہوتی تھیں۔ مقصد ان کا یہی تھا کہ ایک تو اپنے آپ کو مصروف رکھیں اور پھر کچھ educate بھی کریں۔ تو ان میں سے کچھ لڑکے ہمارے پاس آئے اور فیض صاحب سے اور مجھ سے کہا کہ آپ ہمارے سوشلسٹ سنٹر پر آئیں۔ ہم نے

وعدہ کرلیا اور وہ دوسرے روز شام کو ہمیں لینے آ گئے۔ ہم وہاں گئے' چائے وائے پی' انہوں نے سنٹر دکھلایا اور کچھ وہاں ہم لوگوں کی تصویریں وصویریں لیں۔ جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو فیض صاحب نے ان لوگوں سے کہا کہ بھئی ان تصویروں کو ابھی چھپوائیں وپوائیں نہیں' ابھی ہمیں پاکستان واپس بھی جانا ہے۔ تو یہ ایک طرح کی weakness آخری عمر میں ان کے یہاں آ گئی تھی۔ کچھ عمر کا بھی تقاضا تھا۔ پھر ان کو ایسا لگ بھی رہا تھا کہ He is not going to live long لندن آنے سے پہلے جو وہ مختصر عرصے کے لیے پاکستان آئے تھے ۱۹۸۲ء میں تو ایک شام میں اور یوسف جمال بھی شاید میرے ساتھ تھا' ہم بیٹھے ہوئے تھے ان کے ساتھ۔ تو اتنے میں ان کا ایک رشتہ دار تھا پتہ نہیں کیا نام تھا اس کا شاید اصغر تھا۔ ان سے کہنے لگا کہ جی آپ کا ٹائم ہو گیا۔ اصل میں ادھر سلیمہ کو شعیب کو اور منیزہ وغیرہ کو ضیاالحق نے تھوڑا سا' یا ضیاالحق نے نہ بھی کیا ہو تو وہ جو نیچے ہوتے ہیں انہوں نے dislocate کیا ہوا تھا۔ تو پھر انہی دنوں ارباب نیاز جو فیض صاحب کے ساتھ راولنڈی سازش کیس میں تھے' وہ ان دنوں فیڈرل منسٹر تھے ضیاالحق کی حکومت میں' تو ان سے فیض صاحب نے بات کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ اس کے لیے تو چیف سے بات کرنی ہوگی اور میں آپ کو ملوا دیتا ہوں۔ اس طرح ضیاالحق نے ٹائم دے دیا انہیں۔ شام کو آٹھ یا ساڑھے آٹھ بجے کا وقت تھا تو انہوں نے کہا بھئی اب چلنا ہے ان سے ملنے۔ تو مجھے تو یہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ میں نے کہا فیض صاحب آپ بھی....... کہنے لگے ہاں بھئی ہمیں جانا ہے۔ He avoided further questioning. تو خیر وہ چلے

گئے اور ضیاالحق سے مل آئے۔ ضیا نمائشی طور پر جیسا کہ اس کا انداز تھا بڑے خلوص سے ملا اور کہا کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ تو انہوں نے کہا اور تو کچھ نہیں چاہیے بس یہ کہ ہمارے پاکستان آنے جانے میں رکاوٹ نہ ہو۔ اس منحوس نے بڑی چاپلوسی سے کہا کہ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوگا یہ آپ کا ملک ہے جہاں چاہیں آئیں جائیں' آپ پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ تو یہ باتیں بھی بعد میں ہمیں خود فیض صاحب نے بتائی تھیں۔ لیکن مجھے ہی نہیں ان کے بہت سے دوستوں کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ مگر کیا کیا جائے ہر شخص کے اپنے اپنے مسائل ہوتے ہیں اور پھر آدمی ساری عمر کب تک لڑتا رہے؟

اشفاق: فیض صاحب کے ذہن میں کچھ ادبی پروجیکٹس بھی ہوں گے۔ کبھی ان کے بارے میں ان سے بات ہوئی؟

فراز: اصل میں فیض صاحب کے ذہن میں بہت سے پروگرام تھے۔ مثلاً ایک تو وہ کہہ رہے تھے کہ ہم غالب کی ایک تشریح کرنا چاہتے ہیں اپنے انداز سے۔ اس کے علاوہ اور بھی دو تین چیزیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے سارے سخن ہمارے کی رسم اجرا میں جو مضمون پڑھا تھا اس جیسے کچھ اور مضمون لکھیں۔ اس مضمون میں انہوں نے اپنی ایک نظم کے مختلف تخلیقی مراحل پر گفتگو کی تھی۔ اس سے پتہ چلا کہ فیض صاحب کی نظمیں محض آمد ہی آمد نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ان پر بڑا کام کرتے تھے جیسے کوئی کاریگر تراش خراش کرتا ہے۔ وہ بہت وقت لیتے تھے اپنی تخلیقات کو بنانے سنوارنے میں۔

اشفاق: ہاں ان کی بہت سی نظموں پر جو نیچے تاریخ دی ہوئی ہے اس میں کئی کئی تاریخیں دی ہوئی ہیں- جیسے انتساب والی نظم میں تاریخ لکھی ہوئی ہے ۱۹۶۴ اور ۱۹۶۷ء-

فراز: یہی نا ایک تو وہ تراش خراش بہت کرتے تھے دوسرے یہ کہ He was a very slow writer. اس کا تجربہ مجھے یوں ہوا کہ ایک روز ہم ان کے آفس میں گئے تھے' آرٹس کونسل میں تو کہنے لگے اچھا ہوا فراز تم آ گئے یار یہ گل خاں نصیر کی ایک نظم کا ترجمہ کرنا ہے- جو انہوں نے بلوچی میں بھیجی تھی اور اس کا ترجمہ بھی ساتھ تھا' کچھ اس کو پالش کرنا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس میں وہ بہت slow تھے' ان میں وہ quickness نہیں تھی- وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بولتے تھے' میرے خیال میں سوچتے بھی آہستہ تھے- ویسے شاعری کے معاملے میں وہ بہت clear headed تھے- جہاں میٹر کا مسئلہ آتا تھا وہاں وہ بہت محتاط ہونے کے علاوہ وقت بہت لیتے تھے- ویسے کہیں کہیں انہوں نے میٹر سے غفلت بھی برتی ہے مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ان کی گریٹ نس یا بڑائی میں- ٹھیک ہے کئی ایسے اساتذہ ہیں جو کھڑاک سے مصرعے لکھ دیتے ہیں اور وہ پرفیکٹ ہوتے ہیں- اس میں قافیہ' ردیف' بحر وغیرہ سب ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں مگر اس میں ایک چیز جو نہیں ہوتی وہ شاعری نہیں ہوتی- جیسے قانون کی کتابوں میں قانون سارا کچھ ہوتا ہے لیکن جہاں وہ قانون ختم ہوتا ہے اس کے بعد انصاف شروع ہوتا ہے- فیض صاحب بنیادی طور پر ایک جینوئن شاعر تھے لیکن یہ جو ٹیکنیکل چیزیں تھیں اس میں تھوڑے سے وہ تھے پیچھے-

اسی لیے وہ کہتے تھے کہ بھئی یہ غزل ہم نے لکھی ہے ذرا استاد صوفی صاحب کو دکھا دیں تو خود انہیں اس کا احساس تھا اور اسی لیے صوفی صاحب کو وہ کبھی کبھی غزل دکھا دیتے تھے۔

اشفاق: فیض صاحب کے یہاں اکثر خصوصاً ان کی نظموں میں دوسرے شاعروں کے مصرعے پر مصرعے شامل نظر آتے ہیں مثلاً مرے دل مرے مسافر میں کل اٹھارہ مصرعے ہیں جن میں سے شاید ۱۲ یا ۱۳ مصرعے دوسروں کے ہیں۔ یا ابھی جو آپ نے ذکر کیا تھا کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی۔ تو اگر وہ بہت محنت کرتے تھے اپنی نظموں کی تراش خراش پر تو پھر یہ صورت کیوں نظر آتی ہے۔؟

فراز: وہ کہتے تھے کہ بھئی اگر اپنی نظم کے context میں کوئی مصرعہ یا کچھ لائنیں آ رہی ہیں اور ان خیالات کو کسی نے اس سے بہتر طور پر کہا ہوا ہے تو اس میں کیا حرج ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ غالب اور مصحفی کے ان مصرعوں کی جگہ اپنے مصرعے بھی کہہ سکتے تھے لیکن انہوں نے دیانت داری سے سوچا کہ اس سے بہتر میں express نہیں کر سکتا تو اسے انہوں نے جوڑ دیا۔ تو یہ ایک عالمانہ بات تھی۔ ویسے بھی ہمارے یہاں تضمین کی ایک روایت رہی ہے۔

اشفاق: کیا آپ فیض صاحب کے بارے میں کچھ اور کہنا پسند کریں گے؟

فراز: فیض صاحب کے بارے میں تو اور بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں۔ بلکہ یہ کہ ہم نے تو ابھی کچھ بات ڈھنگ سے کی ہی نہیں ہے۔ اگر کبھی فرصت ہوئی تو ان کے بارے میں اور بہت سی باتیں کریں گے۔ فی الحال تو آپ اس ٹیپ ریکارڈر کو بند

لردیں یہ کام پھر کبھی سہی۔

انتخابِ کلام

احمد فراز کی سترویں سالگرہ کے موقعہ پر جب امریکہ اور کینیڈا میں ان کے جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو اس وقت میں نے سوچا کہ انہوں نے جلاوطنی کے زمانے میں جو شاعری کی تھی اس کا ایک بڑا حصہ ان ہی دنوں ملکوں کے مختلف شہروں میں لکھا گیا تھا تو کیوں نہ ان کی شاعری کا انتخاب اس طرح کیا جائے کہ اس دور کی شاعری میں ان کی علاحدہ سے نشان دہی بھی ہو جائے اور کچھ یہاں کے حوالے سے ان کی شاعری کی یاد بھی تازہ ہو جائے۔

بہت سی نظموں کا تو مجھے خود پتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ اس سلسلے میں خود ان سے معلوم کر لیا جاتا۔ چنانچہ میں خاص طور سے اس کام کے سلسلے میں اسلام آباد گیا اور ایک پورا دن ان کے ساتھ لگا کر یہ انتخاب مکمل کیا۔ اس انتخاب میں ان کی وہ تمام شاعری شامل ہے جو انہوں نے یہاں اپنے قیام کے دوران لکھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کو ان کی مکمل خوب صورت شاعری کا انتخاب تو نہیں قرار دیا جا سکتا مگر اس کے ذریعے ایک خاص دور کی یاد ضرور تازہ ہو جاتی ہے۔

کسی بھی شاعر کے کلام کا خصوصاً احمد فراز جیسے شاعر کا انتخاب ایک بہت ہی مشکل کام ہے اور یہ کام بہت زیادہ محنت طلب ہے۔ مگر امریکہ اور کینیڈا کے حوالے سے یہ جو مختصر سا انتخاب میں نے کیا ہے اس کی ایک تاریخی اہمیت ضرور ہے اور شاید کبھی احمد فراز پر کام کرنے والے کسی ریسرچ اسکالر کو اس سے کوئی مدد مل سکے۔ اور اگر ایسا ہو سکا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت کا کچھ پھل مجھے مل گیا۔

مانٹریال۔ کینیڈا

یہی کہا تھا مرے ہاتھ میں ہے آئینہ
تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

مرے چراغ تو سورج کے ہم نسب نکلے
غلط تھا اب کے تری آندھیوں کا تخمینہ

یہ زخم کھائیو سر پر بپاسِ دستِ سُبو
وہ سنگِ محتسب آیا بچائیو مینا

تمہیں بھی ہجر کا دُکھ ہے نہ قرب کی خواہش
سُنو کہ بھول چکے ہم بھی عہد پارینہ

اس ایک شخص کی سج دھج غضب کی تھی کہ فراز
میں دیکھتا تھا، اُسے دیکھتا تھا آئینہ

کیلگری-کینیڈا

سفید چھڑیاں

جنم کا اندھا

جو سوچ اور سچ کے راستوں پر

کبھی کبھی کوئی خواب دیکھے

تو خواب میں بھی عذاب دیکھے

یہ شاہراہِ حیات جس پر ہزار ہا قافلے رواں ہیں

سبھی کی آنکھیں

ہر ایک کا دل

سبھی کے رستے

سبھی کی منزل

اسی ہجومِ کشاں کشاں میں

تمام چہروں کی داستاں میں

نہ نام میرا نہ ذات میری

مرا قبیلہ

سفید چھڑیاں

نیویارک۔ امریکہ

جب کی بات

میں نے کہا تھا
دل کے سفر میں
یوں تو بہت سی منزلیں ہیں
لیکن

جاناں
تم سے آگے کوئی نہیں
آج مگر مجبورِ سفر ہُوں

ٹورنٹو-کینیڈا

واپسی

اس نے کہا
سُن
عہد نبھانے کی خاطر مت آنا
عہد نبھانے والے اکثر
مجبوری یا مجبوری کی تھکن سے لوٹا کرتے ہیں
تم جاؤ
اور دریا دریا پیاس بجھاؤ
جن آنکھوں میں ڈوبو
جس دل میں بھی اُترو
میری طلب آواز نہ دے گی
لیکن جب میری چاہت
اور میری خواہش کی لو
اتنی تیز اور اتنی اونچی ہو جائے
جب دل رو دے
تب لوٹ آنا

نیویارک-امریکہ

اس منظرِ سادہ میں کئی جال بندھے تھے
جب اُس کا گریبان کھلا بال بندھے تھے
اے زُود فراموش کہاں تو ہے کہ تجھ سے
میرے تو شب و روز مہ و سال بندھے تھے
وہ رشکِ غزالاں تھا مگر دام میں اس کے
ہم جیسے کئی صیدِ زبوں حال بندھے تھے
دیکھے کوئی ناصح کی جو حالت ہے کہ ہم تو
اس گیسوئے پیچاں میں بہر حال بندھے تھے
صیّاد کو پھر بھی مری پرواز کا ڈر تھا
میں گرچہ قفس میں تھا پروبال بندھے تھے
یوں دل تہ و بالا کبھی ہوتے نہیں دیکھے
اِک شخص کے پاؤں سے تو بھونچال بندھے تھے
وقت آیا تو میں مقتل۔ شب میں تھا اکیلا
یاروں کی گرہ میں فقط اقوال بندھے تھے

کہاں سے لائیں

نہ یوں کہ آغازِ فصلِ گُل میں
خوشیاں کوئی گیت گائیں
نہ یوں کہ مہجور جنگلوں میں
اُداس جگنو دیئے جلائیں
نہ یوں کہ خندہ دلی سے روئیں
نہ یوں کہ رو رو کے مُسکرائیں
نہ کوئی منظر کہ آشنا ہو
تو ہمدمی کا فریب کھائیں
نہ کوئی اپنا جو غیر سا ہو
کہ جس کو تیرے سخن سنائیں
یہ زندگی کس طرح کٹے گی
وہ یادِ جاناں کہاں سے لائیں

لاس اینجلس۔ امریکہ

دشتِ نامرادی میں ساتھ کون تھا کِس کے
مرثیے سناتی ہے شہر کی ہوا کِس کے

ہم تو کل نہیں ہوں گے دیکھنا کہ محفل میں
اب سخن سُناتا ہے یارِ بے وفا کِس کے

عہدِ ہجر میں یارو سب کے حوصلے معلوم
دل پہ ہاتھ تھا کس کا لب پہ تھی دُعا کِس کے

کل صلیب گر جو تھا کل صلیب پر جو تھا
آج نام لیوا ہیں لوگ جابجا کِس کے

اب فرازؔ تجھ پر بھی اعتبار کیا کیجے
انتظار تھا کس کا ساتھ چل پڑا کِس کے

لبِ گویا

اک شاعرِ درویش و قدح خوار خدا مست
میں کون، جو لکھوں، تری عظمت کے قصیدے
جبریل کے پر ہوں تو وہاں تک نہ پہنچ پاؤں
آواز جہاں سے ترا سازِ ابدی دے
تو وہ ہے کہ الہام ترے حرف کو ترسے
میں وہ کہ مجھے طعن مری بے ہنری دے
تو جبرِ شہی میں بھی علمدارِ جنوں تھا
میں نالہ بہ دل ہوں کہ کوئی ہونٹ نہ سی دے
دہلیز نشیں ہوں میں ترے کاخِ سخن کا
میں کون، مگر تو شرفِ ہم سخنی دے
دے اِذن کہ میں تجھ کو بتاؤں کہ ترے بعد
جو حال ہُوا ہے ترے خوابوں کے چمن کا
اغیار کے ہر وار کو ہم جھیل گئے تھے
ہر چند کہ چرچا تھا بہت دار و رسن کا

تو برشِ شمشیرِ حریفاں سے تھا بسمل
ہم کو ہے گلہ دشنۂ اربابِ وطن کا
" ہے جُرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات"
شیوہ ہے وہی گردشِ افلاکِ کہن کا
ناوک ہی رہا قسمتِ ہر دیدۂ بینا
نیزہ ہی مقدر رہا بے باک دہن کا
اے ہاتفِ اسرارِ بشر سُن کے ترے بعد
کس طرح ترے درس کی توہین ہوئی ہے
معنوں سے تہی کر کے ترے حرفِ خودی کو
شعروں سے فقط وعظ کی تزئین ہوئی ہے
تھی فقر و توکّل کی معنی تری ہستی
یاں کِذب و تصوّف ہی کی تلقین ہوئی ہے
جو مشقِ ستم مشغلۂ اہلِ جفا تھا
وہ رسمِ ستم شہر کا آئین ہوئی ہے
دربار سے وہ رشتہ رہا مفتیِ دیں کا
منبر سے ہر ارشاد پہ آمین ہوئی ہے
ہیں اب بھی وہی بندۂ مزدور کے اوقات
گو دولتِ اربابِ امارت ہوئی وہ چند

ہے اوج پہ سرمایہ پرستی کا نصیبہ
دریوزہ گرِ نانِ شبینہ ہے ہنر مند

پیغامِ مساوات کہ دُنیا کے لیے تھا
واعظ نے کیا کوزہ و تسبیح کا پابند

مسجد میں تو محتاج و غنی ایک ہیں لیکن
منعم کی قبا میں ہے مرے جسم کا پیوند

شاہد ہیں منگورہ کی چٹانیں کہ ہے بڑھ کر
خونِ رگِ انساں سے زمُرد کا گلوبند

یہ مہتر و نوّاب و خوانین و موالی
ہر جا پہ قدامت کے صنم اب بھی وہی ہیں

ہے رزقِ زمیں آج بھی دہقاں کا پسینہ
اندازِ قدح خوارئ جم اب بھی وہی ہیں

اِک تو ہی نہ تھا جس پہ لگی کفر کی تہمت
ہم جیسے شہیدانِ ستم اب بھی وہی ہیں

اب بھی ہیں وہی اہلِ ہوس صاحب محفل
ہم دل زدگانِ شب غم اب بھی وہی ہیں

یہ فتوئی فروش و تہی آغوش و عبا پوش
پیران و فقیہانِ حرم اب بھی وہی ہیں

جو حرفِ جنوں تو نے سکھایا وہ کہوں گا
اے حق کی علامت، مجھے توفیقِ نوا دے
دے بازوئے فرہاد کو وہ تابِ جسارت
جو طرۂ دستارِ رقیباں کو جھکا دے
اب قافلۂ شوق نئی دھن سے رواں ہے
اب پیشِ نظر ہے نئی منزل نئے جادے
اب کجکلہی سَر بگریباں نظر آئے
اب چاک ہوں ذرّوں سے ستاروں کے لبادے
ہر عہد کا نخچیر رہا ہے لبِ گویا
یہ عہد بھی منصور کو سولی پہ چڑھا دے

ٹورنٹو۔کینیڈا

بیروت

یہ سر بریدہ بدن ہے کس کا
یہ جامۂ خوں کفن ہے کس کا
یہ زخم خوردہ روا ہے کس کی
یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی
یہ کس لہو سے زمین یاقوت بن گئی ہے
یہ کس کی آغوش کس کا تابوت بن گئی ہے
یہ کس نگر کے سپوت ہیں
جو دیارِ انگار میں کھڑے ہیں
یہ کون بے آسرا ہیں
جو تیغِ قاتلاں سے
کٹی ہوئی فصل کی طرح جابجا پڑے ہیں
یہ کون ماں ہے
جو اپنے لختِ جگر کو ملبے میں ڈھونڈھتی ہے
یہ کون بابا ہے
جس کی آواز شورِ محشر میں ڈوب گئی ہے

یہ کون معصوم ہیں
کہ جن کو
سیاہ آندھی دیے سمجھ کر بجھا رہی ہے
انہیں کوئی جانتا نہیں
انہیں کوئی جاننا نہ چاہے
یہ کس قبیلے کے سربکف جاں نثار ہیں
جن کو کوئی پہچانتا نہیں ہے
کوئی بھی پہچاننا نہ چاہے
کہ ان کی پہچان امتحاں ہے
کہ ان کی پہچان میں زیاں ہے
نہ کوئی بچہ نہ کوئی بابا نہ کوئی ماں ہے

محل سراؤں میں خوش مقدر شیوخ چپ
بادشاہ چپ ہیں
حرم کے سب پاسبان عالم پناہ چپ ہیں
منافقوں کے گروہ کے سربراہ چپ ہیں
تمام اہلِ ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے لا الٰہ چپ ہیں

بیرُوت

میرے بچّوں کے جسموں پر
زخموں کے پیراہن ہیں
ممتاؤں کی خالی گودیاں
ان کتبوں کے مدفن ہیں
جتنے بھی ساونت جواں تھے
پیہم کٹتے جاتے ہیں
میرے باغ کے جتنے پھول تھے
پل پل گھٹتے جاتے ہیں
لہو لہان ہیں گلیاں کوچے
آنگن خون سے جل تھل ہیں
سب دہلیزوں پر لاشیں ہیں
سب چوراہے مقتل ہیں
کچھ خیمے کچھ زندہ سائے
اب میدان میں باقی ہیں

چند علم کچھ گیت ابھی تک
اس طوفان میں باقی ہیں
تیل کے چشموں کے سوداگر
ان داتا خوش بیٹھے ہیں
محل سرا کے حرم سرا میں
خواجہ سرا خوش بیٹھے ہیں

ٹورنٹو-کینیڈا

اماں مانگو نہ ان سے دلفگاراں ہم نہ کہتے تھے
غنیمِ شہر ہیں چابک سواراں ہم نہ کہتے تھے

خزاں نے تو فقط ملبوس چھینے تھے درختوں سے
صلیبیں بھی تراشے گی بہاراں ہم نہ کہتے تھے

ترس جائیں گی ہم سے بے نواؤں کو تری گلیاں
ہمارے بعد اے شہرِ نگاراں ہم نہ کہتے تھے

جہاں میلہ لگا ہے ناصحوں کا غمگساروں کا
وہی ہے کوچۂ بے اعتباراں ہم نہ کہتے تھے

پسِ زنداں کوئی ہوگا سرِ مقتل کوئی ہوگا
بنے گی اس طرح تصویرِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

فراز اہلِ ہوس نے شہر دشمن ہم کو ٹھہرایا
خطا یہ تھی کہ مدحِ شہر یاراں ہم نہ کہتے تھے

واشنگٹن۔ امریکہ

خوں فروش

اے خدا اسپتالوں میں بھی
اب مرے خون کی کوئی قیمت نہیں ہے
کسی کو بھی میرے لہو کی ضرورت نہیں ہے
میں اپنے بدن میں
(کئی خون کی بوتلیں بیچ کر بھی
ابھی تک لہو کے کٹورے لیے

صبحدم
اس توقع پہ گھر سے نکلتا ہوں

شاید۔۔۔
مگر شام کو بے ثمر لوٹتا ہوں
اُسی گھر میں
جس میں مرے خون کے لوتھڑے
جرعۂ شیر اور پارۂ نان کی آرزو میں
مرا راستہ دیکھتے ہیں
میں ہر روز

ہر وارڈ کو
ملجتی جسم سے دیکھتا ہوں
مگر ڈاکٹر مجھ سے کہتے ہیں
مردُود
اب تیرے خوناب میں
زندگی کی حرارت نہیں ہے
خُدایا
میں کیسے بتاؤں انہیں
خوں فروشی ضرورت ہے میری
تجارت نہیں ہے

واشنگٹن-امریکہ

کبھی نہیں تھے زمانے سے ہارنے والے
پکارتے رہے تجھ کو پکارنے والے
ہمیں شناخت تو کر اے نگارِ صبحِ وصال
ہمی تو ہیں شبِ ہجراں گذارنے والے
جو ہم نہیں تھے تو وہ کون تھے خدا وندا
فلک کا بوجھ زمیں پر اتارنے والے
تو اتنی تنگ نگاہی سے اپنی چال نہ چل
ہم اہلِ دل ہیں کھلے دل سے ہارنے والے
یہ بے گلیم کہ جن کی سپاہ ہے نہ کلاہ
یہی تو لوگ ہیں میدان مارنے والے

نذرِ میر

بہت سیرِ گل اے صبا کر چلے
یہاں تک کہ دل کو قبا کر چلے
وہ تیری گلی تھی کہ کوئے عدو
جدھر بھی گئے سَر اُٹھا کر چلے
جو احوال اپنا ہوا سو ہوا
عبث دوستوں کو خفا کر چلے
رہے دائم آباد محفل تری
ہمارا تھا کیا ہم تو آ کر چلے
نوا سنج ہے اب قفس کا قفس
یہاں تک تو ہم بے نوا کر چلے

نیویارک-امریکہ

اے دیس سے آنے والے بتا

وہ شہر جو ہم سے چھوٹا ہے اب اس کا نظارہ کیسا ہے
ہر دشمنِ جاں کس حال میں ہے ہر جان سے پیارا کیسا ہے
شب بزمِ حریفاں جمتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں
اب محفلِ یاراں کیسی ہے ہر انجمن آرا کیسا ہے
کیا کوئے نگاراں میں اب بھی عشاق کا میلہ لگتا ہے
دل والوں نے قاتل کے لیے مقتل کو سنوارا کیسا ہے
کیا اب بھی ہمارے گاؤں میں گھنگھرو ہیں ہوا کے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں اب وقت کا دھارا کیسا ہے
میخواروں کا پندار گیا میخانوں کا معیار گیا
کل تلخی سے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارا کیسا ہے
مہران لہو کی دھار ہوا بولان بھی کیا گلنار ہوا
کس رنگ کا ہے دریائے اٹک، راوی کا کنارا کیسا ہے
سنتے ہیں کہ سیلِ خوں آیا اور مثلِ شفق ہے رنگِ فلک

وہ سبز زمیں اب کیسی ہے وہ چاند ستارا کیسا ہے
ہر ایک کشیدہ قامت پر کیا اب بھی کمندیں پڑتی ہیں
جب سے وہ مسیحا دار ہُوا ہر درد کا مارا کیسا ہے
کہتے ہیں کہ گھر اب زنداں ہیں کہتے ہیں کہ زنداں مقتل ہیں
یہ جبر خدا کے نام پہ ہے یہ ظلم خدارا کیسا ہے
کیا پچھلے پہر اب بھی آنکھیں بھر آتی ہیں، گرلاتی ہیں
ہر لختِ جگر پر کیا گزری، ہر آنکھ کا تارا کیسا ہے
یہ شامِ ستم کٹتی ہی نہیں، یہ ظلمتِ شب گھٹتی ہی نہیں
میرے بد قسمت لوگوں کی قسمت کا ستارا کیسا ہے
پندار سلامت ہے کہ نہیں بس یہ دیکھو یہ مت پوچھو
جاں ریزہ ریزہ کتنی ہے دل پارا پارا کیسا ہے

نیویارک-امریکہ

جلاوطنی میں
جاتے سال کی آخری شب

جاتے سال کی آخری شب ہے
چہل چراغ کی روشنیوں سے
بادۂ گلگوں کی رنگت سے
جگر جگر کرتے پیمانے
جیسے جاتے سال کی گھڑیاں
جیسے دیئے سے ہوا کی چاہت
جیسے دید کی آخری ساعت
جیسے بھولتی یاد کی کڑیاں
خواب اگر جھوٹے ہوتے ہیں
کب سچی تعبیریں ہونگی
ہاتھوں میں گلدستے لیکن
پاؤں میں زنجیریں ہوں گی

آؤ آخری رات ہے سال کی
دل کہتا ہے بزم و وصال کی
سب شمعیں ساری خوشبوئیں
تن من میں رس بس جانے دو
یہ جو لہو سے اُبر اٹھا ہے
آج کی رات برس جانے دو
لیکن باہر جھانک کے دیکھو
جیسے آج کی رات ستارے
چُپ بیٹھے آکاش کنارے
جاگ رہے ہیں سوچ رہے ہیں
جاتے سال کی آخری شب ہے
کل کا سورج کیسا ہوگا

سان فرانسسکو-امریکہ

جہاں بھی جاتا تو آنکھوں میں خواب بھر لاتا
یہ کیا کہ دل کو ہمیشہ اُداس کر لاتا

میں برف رُتوں میں چلا تو اس نے کہا
پلٹ کے آتا تو کشتی میں دھوپ بھر لاتا

بھلی لگی ہمیں خوش قامتی کسی کی، مگر
نصیب میں کہاں اس سرو کا ثمر لاتا

پیام کیسا، مگر ہو سکے تو اے قاصد
کبھی کوئی شجرِ یار بے خبر لاتا

فراز اب کے جب آؤ دیارِ جاناں میں
بجائے تحفۂ دل، ارمغانِ سر لاتا

میامی-امریکہ

قربت بھی نہیں دل سے اُتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا

آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں لہو سے
اور زخمِ جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

وہ راحتِ جاں ہے مگر اس دربدری میں
ایسا ہے کہ اب دھیان اُدھر بھی نہیں جاتا

ہم دوہری اذیت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل، شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

دل کو تری چاہت پہ بھروسہ بھی بہت ہے
اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

پاگل ہوئے جاتے ہو فراز اس سے ملے کیا
اتنی سی خوشی سے کوئی مر بھی نہیں جاتا

واشنگٹن۔امریکہ

اے میرے وطن کے خوش نواؤ

پاکستان سے آنے والے مہمان شاعروں کے نام

اک عمر کے بعد تم ملے ہو
اے میرے وطن کے خوش نواؤ
ہر ہجر کا دن تھا حشر کا دن
دوزخ تھے فراق کے الاؤ
روؤں کہ ہنسوں سمجھ نہ آئے
ہاتھوں میں ہیں پھول دل میں گھاؤ
تم آئے تو ساتھ ہی تمہارے
بچھڑے ہوئے یار یاد آئے
اک زخم پہ تم نے ہاتھ رکھا
اور مجھ کو ہزار یاد آئے
وہ سارے رفیق پابجولاں
سب کشتۂ دار یاد آئے
ہم سب کا ہے ایک ہی قبیلہ

اک دشت کے سارے ہمسفر ہیں
کچھ وہ ہیں جو دوسروں کی خاطر
آشفتہ نصیب و دربدر ہیں
کچھ وہ ہیں جو خلعت و قبا سے
ایوانِ شہی میں معتبر ہیں
سقراط و مسیح کے فسانے
تم بھی تو بہت سنا رہے تھے
منصور و حسینؑ سے عقیدت
تم بھی تو بہت جتا رہے تھے
کہتے تھے صداقتیں امر ہیں
اوروں کو یہی بتا رہے تھے
اور اب جو ہیں جا بجا صلیبیں
تم بانسریاں بجا رہے ہو
اور اب جو ہے کربلا کا نقشہ
تم مدحِ یزید گا رہے ہو
جب سچ تہہِ تیغ ہو رہا ہے
تم سچ سے نظر چرا رہے ہو
جی چاہتا ہے کہ تم سے پوچھوں

کیا راز اس اجتناب میں ہے
تم اتنے کٹھور تو نہیں تھے
یہ بے حسی کس حساب میں ہے
تم چپ ہو تو کس طرح سے چپ ہو
جب خلقِ خدا عذاب میں ہے
سوچو تو تمہیں ملا بھی کیا ہے
اک لقمۂ تر قلم کی قیمت
غیرت کو فروخت کرنے والو
اک کاسۂ زر قلم کی قیمت
پندار کے تاجرو بتاؤ
دربان کا در قلم کی قیمت
ناداں تو نہیں ہو تم کہ سمجھوں
غفلت سے یہ زہر گھولتے ہو
تھامے ہوئے مصلحت کی میزان
ہر شعر کا وزن تولتے ہو
ایسے میں سکوت، چشم پوشی
ایسا ہے کہ جھوٹ بولتے ہو
اک عمر سے عدل و صدق کی لاش

غاصب کی صلیب پر جڑی ہے
اس وقت بھی تم غزل سرا ہو
جب ظلم کی ہر گھڑی کڑی ہے
جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے
ہے سب کو عزیز کوئے جاناں
اس راہ میں سب جیے مرے ہیں
خود میری بیاضِ شعر میں بھی
بربادیء دل کے مرثیے ہیں
میں نے بھی کیا ہے ٹوٹ کر عشق
اور ایک نہیں کئی کیے ہیں
لیکن غمِ عاشقی نہیں ہے
ایسا جو سبک سری سکھائے
یہ غم تو وہ خوش مآل غم ہے
جو کوہ سے جوئے شیر لائے
تیشے کا ہنر جنوں کو بخشے
جو قیس کو کوہکن بنائے
اے حیلہ گرانِ شہرِ شیریں

آیا ہوں پہاڑ کاٹ کر میں
ہے بے وطنی گواہ میری
ہر چند پھرا ہوں در بدر میں
بیچا نہ غرورِ نے نوازی
ایسا بھی نہ تھا سبک ہنر میں
تم بھی کبھی ہمنوا تھے میرے
پھر آج تمھیں یہ کیا ہوا ہے
مٹی کے وقار کو نہ بیچو
یہ عہدِ ستم، جہاد کا ہے
دریوزہ گری کے مقبروں سے
زنداں کی فصیل خوشنما ہے
کب ایک ہی رُت رہی ہمیشہ
یہ ظلم کی فصل بھی کٹے گی
جب حرف کہے گا قُم بہ اِذنی
مرتی ہوئی خاک جی اٹھے گی
لیلائے وطن کے پیرہن میں
بارود کی بُو نہیں رہے گی
پھر باندھیں گے ابروؤں کے دوہے

پھر مدحِ رخ و دہن کہیں گے
ٹھہرائیں گے ان لبوں کو مطلع
جاناں کے لیے سخن کہیں گے
افسانۂ یار و قصۂ دل
پھر انجمن انجمن کہیں گے

کر گئے کوچ کہاں

اتنی مدّت دلِ آوارہ کہاں تھا کہ تجھے
اپنے ہی گھر کے درو بام بھلا بیٹھے ہیں
یاد یاروں نے تو کب حرفِ محبت رکھا
غیر بھی طعنہ و دشنام بھلا بیٹھے ہیں
تو سمجھتا تھا کہ یہ در بدری کا عالم
دور دیسوں کی عنایت تھا سو اب ختم ہوا
تونے جانا تھا کہ آشفتہ سَری کا موسم
دشتِ غربت کی ودیعت تھا سو اب ختم ہوا
اب جو تو شہرِ نگاراں میں قدم رکھے گا
ہر طرف کھلتے چلے جائیں گے چہروں کے گلاب
دوست احباب ترے نام کے ٹکرائیں گے جام
غیر اغیار چکائیں گے رقابت کے حساب
جب بھی گائے گی کوئی غیرتِ ناہید غزل
سب کو آئے گا نظر شعلۂ آواز میں تو

جب بھی ساقی نے صراحی کو دیا اذنِ خرام
بزم کی بزم پکارے گی کہ آغاز میں تُو
مائیں رکھیں گی ترے نام پہ اولاد کا نام
باپ بیٹوں کے لیے تیری بیاضیں لیں گے
جن پہ قدغن ہے وہ اشعار پڑھے گی خلقت
اور ٹوٹے ہوئے دل تجھ کو سلامی دیں گے
لوگ الفت کے کھلونے لیے بچّوں کی طرح
کل کے روٹھے ہوئے یاروں کو منا لائیں گے
لفظ کو بیچنے والے تنے بازاروں میں
غیرتِ حرف کو لاتے ہوئے شرمائیں گے
لیکن ایسا نہیں ایسا نہیں اے دل اے دل
یہ ترا دیس یہ تیرے در و دیوار نہیں
اتنے یوسف تو نہ تھے مصر کے بازار میں بھی
جنس اس درجہ ہے وافر کہ خریدار نہیں
سر کسی کا بھی دکھائی نہیں دیتا ہے یہاں
جسم ہی جسم ہیں دستاریں ہی دستاریں ہیں
تو کسی قریۂ زنداں میں ہے شاید کہ جہاں
طوق ہی طوق ہیں دیواریں ہی دیواریں ہیں

بوسٹن - امریکہ

اس در پہ ٹھکانہ کبھی اس راہ میں ڈیرا
ہم خانہ بدوشوں کا یہی شام سویرا

بے مہریٔ دنیا کا گلہ ہے ترے لب پر
اب کیسے بتاؤں تجھے میں بھی نہیں تیرا

دو چار قدم ہے یہ کرن ہمسفری کی
پھر آگے وہی شہرِ جدائی کا اندھیرا

ہیں بھی جو تنک خُو تو زمانے کے لیے ہیں
اے جاں کبھی ہم نے ترا فرماں نہیں پھیرا

اک مُشتِ غُبار اور کفِ موجِ ہوا پر
چاہا تو سمیٹا ہے نہ چاہا تو بکھیرا

مل جائے جو غربت میں فراز اب وہی ہمدم
ہو جائے جہاں شام وہیں رین بسیرا

واشنگٹن۔ امریکہ

بن باس کی ایک شام

یہ آخری ساعت شام کی ہے
یہ شام جو ہے مجبوری کی
یہ شام اپنوں سے دوری کی
اس شام افق کے ہونٹوں پہ
جو لالی ہے زہریلی ہے
اس شام نے میری آنکھوں سے
صہبائے طرب سب پی لی ہے
یہ شام غضب تنہائی کی
پت جھڑ کی ہوا برفیلی ہے
اس شام کی رنگت پیلی ہے
اس شام فقط آواز تری
کچھ ایسے سنائی دیتی ہے
آواز دکھائی دیتی ہے
یہ آخری ساعت شام کی ہے
یہ شام بھی تیرے نام کی ہے

اٹلانٹا-امریکہ

قربِ جاناں کا نہ میخانے کا موسم آیا
پھر سے بے صرفہ اجڑ جانے کا موسم آیا
کنجِ غربت میں کبھی گوشۂ زنداں میں تھے ہم
جانِ جاں جب بھی ترے آنے کا موسم آیا
اب لہو رونے کی خواہش نہ لہو ہونے کی
دلِ زنداں ترے مرجانے کا موسم آیا
کوچۂ یار سے ہر فصل میں گزرے ہیں مگر
شاید اب جاں سے گزر جانے کا موسم آیا
کوئی زنجیر، کوئی حرفِ خرد لے آیا
فصلِ گل آئی کہ دیوانے کا موسم آیا
سیلِ خوں شہر کی گلیوں میں در آیا ہے فراز
اور تُو خوش ہے کہ گھر جانے کا موسم آیا

ثریاں-کینیڈا

وہی عشق جو تھا کبھی جنوں اسے روز گار بنادیا
کہیں زخم بیچ کے آگئے کہیں شعر کوئی سنا دیا
وہی ہم کہ جن کو عزیز تھی در آبرو کی چمک دمک
یہی ہم کہ روزِ سیاہ میں زرِ داغ دل بھی لٹا دیا
کبھی یوں بھی تھا کہ ہزار تیر جگر میں تھے تو دکھی نہ تھے
مگر اب یہ ہے کسی مہرباں کے تپاک نے بھی رلا دیا
کبھی خود کو ٹوٹتے پھوٹتے بھی جو دیکھتے تو حزیں نہ تھے
مگر آج خود پہ نظر پڑی تو شکستِ جاں نے ہلادیا
کوئی نامہ دلبرِ شہر کا کہ غزل گری کا بہانہ ہو
وہی حرف دل جسے مدتوں سے ہم اہلِ دل نے بھلا دیا

نامۂ جاں

مدتوں بعد ملا نامۂ جاناں لیکن
نہ کوئی دل کی حکایت نہ کوئی پیار کی بات
نہ کسی حرف میں محرومیِ جاں کا قصہ
نہ کسی لفظ میں بھولے ہوئے اقرار کی بات
بس وہی ایک ہی مضموں کہ مرے شہر کے لوگ
کیسے سہمے ہوئے رہتے ہیں گھروں میں اپنے
اتنی بے نام خموشی ہے کہ دیوانے بھی
کوئی سودا نہیں رکھتے ہیں سروں میں اپنے
اب قفس ہی کو نشیمن کا بدل جان لیا
اب کہاں طاقتِ پرواز پروں میں اپنے
وہ جو دو چار سبوکش تھے کہ جن کے دم سے
گردشِ جام بھی تھی رونقِ میخانہ بھی تھی
وہ جو دو چار نواگر تھے کہ جن کے ہوتے
حرمتِ نغمہ بھی تھی جراءتِ رندانہ بھی تھی
کوئی زنداں کوئی مقتل کوئی پردیس گیا

چند ہی تھے کہ روش جن کی جداگانہ بھی تھی
اب تو بس بردہ فروشی ہے جدھر بھی جاؤ

سرِ دربار ستادہ ہیں بیاضیں لے کر
وہ جو کچھ دوست کبھی صاحبِ کردار لگے

غیرتِ عشق کہ کل مالِ تجارت میں نہ تھی
آج دیکھو کہ ہیں انبار کے انبار لگے

ایسا آسیب زدہ شہر کہ دیکھا نہ سنا
ایسی دہشت ہے کہ پتھر ہوئے سب کے بازو

در و دیوارِ خرابات وہی ہیں لیکن
نہ کہیں قلقلِ مینا نہ گلِ بانگِ سبو

بے دلی شیوہ ء اربابِ محبت ٹھہرا
اب کوئی آئے کہ جائے تنا تا ہو یا ہو

کالی دیوار

کل واشنگٹن شہر کی ہم نے سیر بہت کی یار
گونج رہی تھی سارے جگ میں جس کی جے جے کار
ملکوں ملکوں ہم گھومے تھے بنجاروں کی مثل
لیکن اس کی سج دھج سچ مچ دلداروں کی مثل
روشنیوں کے رنگ بہیں یوں رستہ نظر نہ آئے
من کی آنکھوں والا بھی یاں اندھا ہو ہو جائے
بالا بام ' چراغاں رستے ' روپ بھرے بازار
جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے خوابوں کا سنسار
ایک سفید حویلی جس میں بہت بڑی سرکار
یہیں کریں سوداگر چھوٹی قوموں کا بیوپار
یہیں پہ جادو گر بیٹھا جب کہیں کی ڈور ہلائے
ہر بستی ناگاساکی ' ہیرو شیما بن جائے
اسی حویلی سے کچھ دور ہی اک کالی دیوار
لوگوں کی وہ بھیڑ لگی تھی چلنا تھا دشوار
اس کالی دیوار پہ کندہ دیکھے ہزاروں نام

ان ناموں کے بیچ لکھا تھا شہدائے ویتنام
دور دور سے جمع ہوئے تھے طرح طرح کے لوگ
آنکھوں آنکھوں ویرانی تھی چہروں چہروں سوگ
بیکل بہنیں ، گھائل مائیں ، کرلاتی بیوائیں
ساجن تم کس دیس سدھارے پوچھیں محبوبائیں
اپنے پیارے دلداروں کا اوجھل مکھڑا ڈھونڈیں
اس کالی دیوار پہ ان کے نام کا مکھڑا ڈھونڈیں

قلم کا سفر

شاعری کی میزان پر اگر تولا جائے تو پاکستان کی ساٹھ سالہ تاریخ میں احتجاجی شاعری کا پلڑا ہی بھاری نظر آئے گا۔ اس کارواں میں جو لوگ شامل ہیں ان کی تعداد ان گنت ہے اور وہ سب ہی احترام کے لائق ہیں لیکن اسی دور میں اردو کی احتجاجی، سیاسی اور انقلابی شاعری نے ایک بہت ہی خوب صورت مثلث ترتیب دی ہے جسے ہم فیض احمد فیض، حبیب جالب اور احمد فراز کے نام سے جانتے ہیں۔

اس مثلث کے تیسرے کنارے احمد فراز کو بھی آج ہم الوداع کہہ چکے ہیں جس نے کہا تھا کہ میرا قلم میرے لوگوں کی امانت اور میرے ضمیر کی عدالت ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے امید بھرے لہجے میں ایک نوید بھی سنائی تھی کہ

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصار ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

احمد فراز، ڈاکٹر لوڈ میلا وسی الویا، ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور اشفاق حسین (ٹورنٹو ۲۰۰۴)

کینیڈا کے ممبر پارلیمنٹ جم کیری گینیس، احمد فراز کو اردو انٹرنیشنل کی جانب سے ایوارڈ دے رہے ہیں۔ (ٹورنٹو ۱۹۹۹)

احمد فراز، فیض احمد فیض، عرفانہ اور اشفاق حسین (ٹورنٹو ۱۹۸۳)

احمد فراز، احمد ندیم قاسمی اور اشفاق حسین (نیودہلی ۱۹۸۹)